فہرست مضامین

فہرست تقریظات حالی

۱۔ ”ہمدردی“ پر ایک لکچر

مولانا کا یہ لکچر ”دہلی سوسائٹی“ کے عظیم الشان جلسہ واقع ۲۱ را پریل ۱۸۶۷ء میں ہوا تھا۔ اور ”انجمن مفید عام قصور“ کی طرف سے جو ماہوار رسالہ شائع ہوتا تھا اُس کے ماہ اپریل ۱۸۶۷ء کے پرچے میں چھپا تھا۔

یہ جلسۂ مبارک جس میں مختلف قوموں کے ممتاز اور جلیل القدر آدمی جمع ہیں اور ظاہر اُن کا تشریف لانا کسی ذاتی غرض کے لئے نہیں معلوم ہوتا، انسان کی اُس خصلت کا ایک عمدہ نمونہ ہے جس پر مجھکو اس وقت بحث کرنی منظور ہے، اور جو آج کل ہمدردی کے نام سے مشہور ہے۔ ہمدردی کا لفظ ہم اور درد دو فارسی کلموں سے مرکب ہے۔ درد کے معنی دُکھ اور تکلیف کے ہیں اور ہم کا لفظ اشتراک کے معنی دیتا ہے۔ پس ہمدردی کے لفظ سے دو یا کئی شخصوں کا دُکھ اور تکلیف میں شریک ہونا ظاہر ہوتا ہے، خواہ ارادہ سے ہو خواہ بے ارادہ، مگر آج کل کے استعمال میں ہمدردی سے وہ شرکت مراد لیجاتی ہے جو ارادہ سے کیجائے مثلاً ایک شخص بیمار ہے اور دوسرا رحم یا محبت سے اُس کی دوا دارو کرتا ہے، تو دوسرے کو پہلے کا ہمدرد کہیں گے۔

ہمدردی پر جس قسم کی بحث فلاسفی میں کی گئی ہے اُس کا ذکر کرنا شاید اس موقع پر مناسب نہ ہوگا۔ پس میں اُس کی ماہیت بیان کرنے کی نسبت زیادہ تر اُس کے نتائج سے بحث کرونگا۔

اگر یہ بات سچ ہے کہ تمام انسان اصل میں ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں اور ایک ہی دریا کے مختلف شعبے ہیں تو یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ تمام انسان ایک دوسرے کی ہمدردی

کے ذمہ دار ہیں، اور ہر شخص مصیبت کی حالت میں اپنے ہمجنسوں سے مدد لینے کا استحقاق رکھتا ہے۔ کون ہے جو اس بات سے انکار کرے گا کہ بھائی کو بھائی سے ایک تعلق ہے جو ایک کو دوسرے کی ہمدردی پر مجبور کرتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اُن بھائیوں کی اولاد میں اُس ہمدردی کا کوئی حصہ باقی نہ رہے۔ بیشک جبتک کہ باپ کے خون کا قطرہ اولاد کی رگ و پے میں باقی ہے ہمدردی کا رشتہ کبھی منقطع نہیں ہو سکتا۔ ہمدردی اور حیوانات میں بھی پائی جاتی ہے۔ بچوں کو ایک مدت تک پرورش کرنا، اُن کے لئے غذا بہم پہنچانی، تا بمقدور ان کو دشمن کے حملہ سے بچانا سب جانوروں کی عام خصلت ہے۔ اس کے سوا عام ہمدردی بھی اُن میں دیکھی گئی ہے۔ جنگلی بطخوں کا غول جب کسی کھیت میں اُترتا ہے اور وہاں کسی طرح کا کھٹکا نہیں پاتا تو سب کے سب ایک صف باندھ کر دانہ چُگتے ہیں۔ مگر اُن میں سے ایک ایک بطخ نوبت بہ نوبت اپنے ہمجنسوں کی چوکسی کرتی ہے اور جب تک پہرا دیتی رہتی ہے ایک دانہ نہیں کھاتی۔ چیونٹا جب کہیں اناج کا ذخیرہ پاتا ہے تو کبھی تن پروری نہیں کرتا بلکہ اُسی وقت اپنے ہمجنسوں کو خبر کر دیتا ہے اور تھوڑی سی دیر میں لاکھوں چیونٹوں کو وہاں جمع کر دیتا ہے۔ اسی طرح اور مثالیں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں ایک یہ کہ ہمدردی انسان کی طبیعت میں بھی ضرور رکھی گئی ہے۔ کیونکہ جو خوبیاں قدرت نے اور حیوانات کو عنایت کی ہیں انسان اُن کا زیادہ تر مستحق ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمدردی ایک قدرتی خاصیت ہے جو بغیر تعلیم اور اکتساب کے انسان کی طبیعت میں خود بخود جوش مارتی ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو اور حیوانات میں جو عقلی تعلیم سے بالکل محروم ہیں اس کا وجود ہرگز نہ پایا جاتا۔

ہمدردی انسان میں اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ کارخانۂ دنیا کا انتظام برہم نہ ہونے پائے کیونکہ انسان اپنی ضروریات میں ایک دوسرے کے محتاج ہیں، ایک کی گاڑی دوسرے کی مدد کے بغیر نہیں چل سکتی۔ سب سے زیادہ حقیر حلال خور کی قوم سمجھی گئی ہے مگر وہ بھی ایسی ضروری جماعت ہے جس کے بغیر دنیا کا کام نہیں چل سکتا۔ پس اگر انسانوں میں ہمدردی نہ ہو تو یہ تمام

جس کے خوش کرنے اور جس سے داد لینے کے لئے شاعر کو اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ کہیں کہیں تہذیب کی حد سے متجاوز ہو کر سامعین کے دل کو لبھائے جائیں یہی وہ مجبوری ہے جس نے ہماری شاعری کو گندہ اور ناپاک کر دیا ہے۔ لیکن اگر اس دیوان میں سے غیر مہذب اشعار نکال دئے جائیں تو بھی ایک معتد بہ مجموعہ مہذب اور شائستہ کلام کا باقی رہتا ہے جو صاحبِ دیوان کی ایک عمدہ یادگار ہو سکتا ہے۔

گھوڑے چڑھ کے چلنے میں　　پانو پاسر(۱) گلے رکاب
آئے صاحب جنٹل میں　　ہاتھ ہتھوڑے(۲) پانو جراب
اونچا کوٹ لمبی پتلون　　یوہی ہمارے بڑے نباب(۳)
دارو پی کے ٹہلن لاگے　　موہہ مان چرٹ ہاتھ کتاب
تون دلیرا جیب(۴) کا پھوڑا　　یا جیبا(۵) نو دانتوں(۶) داب
موہہ ماں بان(۷) چلائے جیب　　سگڑی(۸) آپھت(۹) ڈھاوے جیب
یا جیبا کے سگڑے کھوٹ　　بھیئون(۱۰) راڑ(۱۱) کرا دے جیب
کدھیں(۱۲) تو بولے امرت بول　　کدھیں بکھ کھنڈا دے جیب
پٹ(۱۳) سوں بول(۱۴) اپاوے(۱۵) کے بول　　ترت پھرت لک جائے جیب
جیب(۱۶) کہا ہے تنک سی جونک　　لہو ماس کھا جاوے جیب
دھرتی(۱۷) پا لکھوں کرے بگاڑ　　انبر آگ لگاوے جیب
یوہی گیرائے(۱۸) نرکھوں کنڈ　　یوہی سُرگ(۱۹) کماوے جیب
تون دلیرا جیب کے بس میں　　تیری کوئی کٹاوے جیب

افسوس ہے کہ اس دیوان میں جتنے اصناف کا کلام ہے ان سب کا نمونہ [ہم] نہیں دکھا سکتے کیونکہ بہت سے اشعار ہزل بلکہ فحش کی حد تک پہنچ گئے ہیں۔ [لیک]ن جہاں تک خیال کیا جاتا ہے اس میں زیادہ تر ہماری سوسائٹی کا قصور ہے۔

---

(۱) پانو پر سر اور گلے میں رکاب (۲) دستانے (۳) نواب (۴) زبان کا پھوڑا۔
(۵) اس زبان کو (۶) دانتوں تلے داب (۷) تیر (۸) ساری (۹) آفت (۱۰) بھائیوں
[می]ں (۱۱) تکرار (۱۲) کبھی (۱۳) نہر (۱۴) جلدی ہو (۱۵) فساد کے بول بولکر (۱۶) جیب کیا ہے
[ذ]راسی جونک (۱۷) زمین پر (۱۸) ڈالے نرک کے کھنڈ میں (۱۹) بہشت

میں کیلی تونے بن بن ڈھونڈوں — تو تو جوڑا بچھڑ گیو سارس کا

دو ڑیوے دو ڑیو میرے بگڑ وھاڑ اڑا — ناج کھایو۔ مال کھوسا(۱) ایک چھوری(۲) نے ہڑا(۳)

توں مڑوٹے(۴) سیج(۵) مارے سانجھ(۶) سوں تڑکا(۷) کاڑ — میں لکھاؤں(۸) باٹ تیری گانو کے گوٹے(۹) کھڑا

تیر ڑکاں(۱۰) سوں چلائے سین(۱۱) مارے نین(۱۲) سوں — کے گیو تیرو(۱۳) کوکرمی(۱۴)! ڈھوڑ میں مارا پڑا

مات کھائی لات کھائی دھول جوتی اوٹلی — ہوگیا دلگیر! توں تو اسک(۱۵) ماں چکن(۱۶) گھڑا

اسک کر گیا پھجیت(۱۷) ہوگی(۱۸) اسک کی مت بیرا — بوئے کھیت رنڈ کے(۱۹) بو وا کن کھائے لکڑی کھیرا

باڈھی(۲۰) کے نے پران گنوائے اسک لا(۲۱) کے سیری(۲۲) سے — کھسر(۲۳) کی تو موچھ نہ کھوسی(۲۴) آپوا پنا سر چیرا

لیلیٰ پاچھے ہوؤ(۲۵) باوڑا(۲۶) مجنوں(۲۷) کی کر مت ہینی — سگری(۲۸) پاگ ٹوک کرلاڑی(۲۹) لتا سگ لیرم لیرا

ہیر(۳۰) نمانی ہوئی دوانی، رانجھے لیکے دکھ(۳۱) اوٹے — بیت(۳۲) کروں پر بیت جائے ہی بیت نکرے دلگیرا!

لارتے(۳۳) کلاڑکے! پھول سرب(۳۴) — سیسہ(۳۵) دمکے جیسے گڑاب(۳۶)

پانو پاگ(۳۷) کاکھ(۳۸) میں جوتی — ایسی دارو(۳۹) پیو زناب(۴۰)

---

(۱) چھینا (۲) لڑکی (۳) لوٹ لیا (۴) کروٹیں (۵) سیج پر (۶) شام سے (۷) صبح نکلنے تک
(۸) دیکھوں (۹) قریب (۱۰) پلکوں سے (۱۱) اشارے (۱۲) آنکھ سے (۱۳) کیا گیا تیرا (۱۴) اے ظالم! یعنی مارا تو میں گیا (۱۵) عشق (۱۶) چکنا گھڑا (۱۷) فضیحت (۱۸) عشق (۱۹) بو کر کھیت میں ارنڈ کے پودے کس نے کھایا ہے ککڑی کھیرا (۲۰) بڑھئی کے بیٹے فرہاد نے (۲۱) لگا کے (۲۲) شیریں سے
(۲۳) خسرو (۲۴) کھسوٹی (۲۵) ہوا (۲۶) باولا (۲۷) مجنوں کی کیسی بودی عقل تھی۔
(۲۸) ساری پگڑی ٹکڑے کر ڈالی (۲۹) لتے سارے لیر لیر ہوگئے (۳۰) بھولی (۳۱) اٹھانے (۳۲) بیت کر کیسر
(۳۳) اے کلاں والے (۳۴) عمدہ شراب (۳۵) بوتل (۳۶) گلاب (۳۷) پانو پر پگڑی (۳۸) بغل میں جوتی
(۳۹) شراب (۴۰) جناب

اپنے صاحب یعنی خدا سے کہتا ہے کہ کیا میں نے تیری بھوری بھینس چھین لی ہو جو تو نے مجھ پر یہ مصیبت ڈالی ہے۔ چونکہ گنوار لوگ بھوری بھینس کو بہت عزیز رکھتے ہیں، اس لئے انھیں کے خیالات کے موافق خدا سے کہتا ہو کہ کیا میں نے تیری بھوری بھینس چھین لی ہو جس کا تو نے مجھ سے یہ بدلہ لیا ہے۔

چھٹ گئے سگڑے(۱) ناتی گوتی(۲) — دادا نانا پوت(۳) پڑ(۴) ڈتی

ناؤ(۵)، بامن(۶)، ہالی(۷)، گمیرٹے(۸) — جنھاں(۹) نت میرے ڈانگر گھیرے

کہاں گئے اوہ(۱۰) ایکھہ کے گانڈے(۱۱) — کہاں گئے اوہ مینڈے(۱۲) ڈانڈے

کہاں گئی اوہ کھیتی مھاری — کہاں گئی اوہ گاجر کیاری

اسی طرح کہیں جتی سے اور چوپاڑ کے ساتھیوں کو یاد کرتا ہو، کہیں بھابھڑ کے بانوں سے بُنی ہوئی کھاٹ، کھٹولی، گوبر کی ڈھیریوں، سانی کی ناندوں، دودھ دہی کی کوری مٹکیوں، سرسوں کے ساگ اور مکا کی روٹی اور اسی قسم کی اور چیزوں کا جو دیہاتی زندگی کے مناسب ہیں حسرت کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔

سب سے زیادہ لحاظ کے قابل اس دیوان میں یہ بات ہو کہ ظاہرا دلگیر سے پہلے کسی نے گنواری زبان میں دیوان مدون نہیں کیا اور نہ اتنے مختلف مضامین جتنے کہ اس دیوان میں ہیں کبھی اس زبان میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس میں حمد و نعت منقبت اخلاق، مدح، ہزل عشق، ہجر وصل، رشک غرضکہ وہ تمام بیانات جو اردو کے عام دیوانوں میں پائے جاتے ہیں، موجود ہیں۔ پس اردوئے معلی کے شعرا جو کئی سو برس

---

(۱) سالے (۲) رشتہ دار (۳) بیٹا (۴) پوتے کی بیٹی (۵) نائی (۶) برہمن (۷) ہل چلانیوالا (۸) خادم (۹) (جو ہمیشہ میرے مویشی گھیر گھیر کے لاتے تھے) (۱۰) وہ (۱۱) گنّے (۱۲) کھیت کی ڈول اور پگڈنڈی۔

سورج کا ڈھے[1]، چندر چمکاوے — پربت ڈھاوے[2] سمندر[3] بہاوے

توہی لاڑے[4] میگھ ملارا[5] — توں ہی بواوے بوہنڈا[6] مہارا[7]

توں کھیتاں نوبیاں چلاوے — توں پودا نو دھوپ لگاوے

کھیت اگاوے ناج پکاوے — سگری[8] پرجا، جا[9] نو کھاوے

سورج اور چاند کا نکالنا، پہاڑوں کا بلند کرنا، سمندر کا بہانا، مینہ برسانا، زمین بوانا کھیتی پر ہوا چلانا، اُس پر دھوپ نکالنا، بیج اُگانا، اناج پکانا اور اس سے ساری مخلوق کی پرورش کرنا، یہ سب ایسے صاف اور کھلے ہوئے مظاہر قدرت ہیں جن سے بڑھ کر خدا کی عظمت و جبروت کا خیال خاص کر ایک زراعت پیشہ دیہاتی گنوار کے دل میں کسی ذریعہ سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔

تجھ[10] بنا جن کوئی دوجا پوجا[11] — واکی[12] انکھاں نیل کا سوجا

دین دُنی کی کھوئی کھوبی[13] — واکی[14] نیا[15] ریت میں ڈوبی

ہے مرے صاحب بکسن[16] ہارے — پاڑ دسے[17] کھوٹے کا گد[18] مہارے

توں ہی ہمارا پالن ہارا — تیرا ان[19] کھاوے جگ سارا

دلیرا ہے تیرا دا[20] سی — توہی دے گا تاتی[21] باسی

یہ چند بیتیں اس نظم میں سے لی گئی ہیں جو دلپسند نے اپنے دیوان کے شروع میں حمد الٰہی میں لکھی ہیں۔ ان کے پڑھنے سے ہر شخص جو شاعری کا صحیح مذاق رکھتا ہے بخوبی

---

(۱) نکالے (۲) اٹھاوے یعنی بلند کرے (۳) سمندر (۴) نکالے یا برسائے (۵) باران رحمت (۶) کھیت (۷) ہمارا (۸) ساری مخلوق (۹) جس کو (۱۰) تیرے سوا جس نے (۱۱) پوجا (۱۲) اس کی آنکھوں میں سوا یعنی سلائی (۱۳) خوبی (۱۴) اس کی (۱۵) کشتی (۱۶) بخشنے والا۔ (۱۷) پھاڑ دے (۱۸) کاغذ یعنی نامہ اعمال (۱۹) رزق (۲۰) غلام (۲۱) گرم یعنی تازی روٹی

جس زبان میں یہ دیوان مرتب ہوا ہے وہ درحقیقت ایک قسم کی بگڑی ہوئی اردو ہے۔ جیسا کہ ہر ملک میں دیہاتیوں اور گنواروں کی زبان شہر والوں کی بگڑی ہوئی زبان ہوتی ہے پس اس دیوان میں زیادہ تر وہی الفاظ جو فصیح اُردو میں صحیح طور پر مستعمل ہوتے ہیں کسی قدر تغیر کے ساتھ گنواری بول چال میں استعمال ہوتے ہیں جیسے خالق اور کھالک، باپ اور باپو، مھارے اور ہمارے، چپّے چپّے اور چیاں چپاں، تونے اور تیں نے، کیا اور کینا، دیا اور دینا، وغیرہ وغیرہ ظاہر ہے کہ ایک موزوں طبع آدمی کو جس کی مادری زبان شہری فصیح اُردو ہو، بگڑی ہوئی اُردو سیکھ لینا اور اس میں اشعار موزوں کرنا زیادہ دشوار نہیں ہے مگر جو بات دشوار اور سخت دشوار ہے اور جس پر سوا اُس شخص کے جو ماں کے پیٹ سے شاعر پیدا ہوا ہو کوئی قادر نہیں ہو سکتا، وہ یہ ہے کہ جو مضمون ایک گنواری زبان میں بیان کیا جائے اس کا پیرایۂ بیان بھی گنواروں کے محدود خیالات کی حد سے متجاوز نہ ہو۔ کیونکہ فصاحت درحقیقت اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے کہ مثلاً اگر بچوں کے ساتھ بات چیت کرو تو بچے بن جاؤ اور گنواروں کے ساتھ گفتگو کرو تو اپنے تئیں ٹھیٹ گنوار بنالو جیسا کہ کہا گیا ہے

اس دیوان میں یہی وہ چیز ہے جو دلمیسر کے اصلی اور قدرتی شاعر ہونے پر بہ آواز بلند گواہی دیتی ہے جس طرح اس کی زبان گنواری ہے اسی طرح اس میں ہر ایک مضمون گنواروں کے خیالات کے موافق ادا کیا گیا ہے۔ وہ خدا کی تعریف اس طرح شروع کرتا ہے۔

ہی مرے کھالک! ہی مرے مالک! تو باپو ہم تیرے بالک

(ہے = حرف ندا یعنی اے۔ کھالک = خالق۔ باپو = باپ) خدا کی عظمت کا بیان گنواروں کے خیالات کے موافق اس سے بہتر کسی پیرایہ میں نہیں ہو سکتا کہ اس کو باپ اور اپنے تئیں اس کے بچے قرار دیں۔

مھارے(۱) حاکم ہو، مھارے سوا(۲) ئی چپاں چپاں(۳) تیری دُہائی

(۱) ہمارے (۲) سردار (۳) چپے چپے

کلّیاتِ دلیرؔ

کلیات دلیر ایک خاص نوعیت کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ مولانا حالی سے اس کلیات کو عوام سے روشناس کرولنے اور اس کے محاسن ظاہر کرنے کی فرمائش کی گئی تھی جس پر مولانا نے یہ ریویو لکھا۔ ریویو سب سے پہلے دسمبر ۱۹۰۱ء کے "معارف" میں شائع ہوا۔ پھر مولانا وحید الدین سلیم نے اس کو "مضامین حالی" میں شائع کیا۔ (از "مضامین حالی" صفحہ ۲۳۵ مرتبہ مولانا وحید الدین سلیم ۱۹۰۲ء)

کلیات دلیر ایک نئی قسم کا دیوان ہے جس سے غالبًا خاص خاص شخصوں کے سوا بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ صاحب دیوان ایک بزرگ منور خاں نام دلیر تخلص۔ رئیس میرٹھ ہیں ۱۸۵۰ء میں انھوں نے کچھ نظمیں گنواری زبان میں جو درمیان دوآب و ہریانہ کے دیہات میں عموماً بولی جاتی ہے، لکھ کر مرحوم ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ کی حضور میں پیش کی تھیں۔ وہاں اُن نظموں کی بہت داد ملی اور بادشاہ نے انعام اور خلعت عنایت کیا۔ اس قدر دانی نے میاں دلیر کے خیالات پر وہی اثر کیا جو سلطان سنجر کے ملک الشعرا کا تزک و احتشام دیکھ کر اوحد الدین انوری کے دل پر ہوا تھا۔ انھوں نے اُسی گنواری زبان پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی اور رفتہ رفتہ ایک نئی قسم کا دیوان مرتب کر لیا جو اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے۔

میرے ایک لائق دوست نے جو شاعری کا صحیح مذاق رکھتے ہیں مجھ سے یہ فرمائش کی ہے کہ اس دیوان میں جو شاعرانہ خوبیاں اور محاسن ہیں، ان کو کسی قدر پبلک پر ظاہر کروں اور لوگوں سے میاں دلیر اور ان کے کلام کو روشناس کراؤں۔

قصہ مختصر جس ذوق و شوق سے معزز مؤلف نے اس تذکرے کے لکھنے پر کمر باندھی ہے اور جس استقلال کے ساتھ وہ طالب علمی کے زمانے سے لیکر آجتک ان تمام مشکلات پر غالب آتے رہے ہیں جو اس مفید کام کے انجام دینے میں اُن کو پیش آئیں اُس سے اس عام خیال کی بوجہ احسن تردید ہوتی ہے کہ انگریزی تعلیم بجائے اس کے کہ قومی تعصبات سے دلوں کو پاک کرے اور الٹی تعصب و ناگواری کی آگ ملک میں مشتعل کرنے والی ہے۔

بہرحال ہم دل سے دعا کرتے ہیں کہ جو مفید کام ہمارے دلی دوست مسٹر سری رام صاحب نے شروع کیا ہے، اللہ تعالیٰ اُسے بخیر و خوبی انجام کو پہنچائے اور اس تصنیف کو قبول عام کے زیور سے آراستہ فرمائے۔

آخر میں ہم معزز مصنف کی خدمت میں اس بات کے عرض کرنے کی معافی چاہتے ہیں کہ صفحہ ۳۰۸ پر جہاں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ کا حال لکھا گیا ہے اس میں چند فروگذاشتیں ہوگئی ہیں، اول تو شاہ صاحب ممدوح کا اُردو زبان میں شعر کہنا اور اشتیاق تخلص کرنا ثابت نہیں ہوا۔ دوسرے ان کا وطن سرہند اور مجدد الف ثانی کی نسل سے ہونا اور فیروز شاہ کے کوٹلہ میں سکونت پذیر ہونا غلط معلوم ہوتا ہے۔ کسی طریقہ سے اس غلطی کی اصلاح فرما دیجائے۔

توجو مضامین پہلے نمبر میں شائع ہوئے ہیں وہ نہایت دلچسپ اور رسالے کے مقصد کے لحاظ سے نہایت موزوں ہیں۔ دوسرے رسالے کا مقصد ایسا اہم اور ضروری ہے جو پبلک کو بزور اُس کی طرف متوجہ کرے گا۔ تیسرے دہلی جو اُردو زبان کا مرکز ہو اُس کا دارالخلافہ بننا رسالے کی اشاعت کے حق میں خود ایک بڑی فال نیک ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہو کہ جس زبردست ہاتھ میں رسالے کی باگ ہے وہ ہاتھ ہی اُس کی ترقی اور قیام کا ضامن ہو۔

ہماری دعا ہے کہ یہ رسالہ تمام ملک میں قبولیت کا درجہ حاصل کرے اور اردو زبان کو اُس سے خاطرخواہ فائدہ پہنچے اور مالک و مہتم کی مساعی جمیلہ مشکور ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

رسالہ "اردو"

(منقول از رسالہ "اردو" لاہور بابت اکتوبر ۱۹۱۳ء صفحہ ۲-۳)

مولوی فتح محمد خاں مرحوم جالندھری نے "اردو" کے نام سے ایک ماہوار
رسالہ لاہور سے نکالا تھا اس کا پہلا ڈبل نمبر ستمبر و اکتوبر ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا۔
ناقدری کی وجہ سے دو ہی تین نمبر نکلنے کے بعد بند ہو گیا۔

"اردو"، اس نام کا ایک رسالہ پنجاب کے نامور مصنف جناب مولوی فتح محمد
خاں صاحب جالندھری نے انھیں دنوں میں شہر جالندھر سے نکالا ہے جس کا پہلا نمبر
میری نظر سے گذرا۔ تقریباً دس برس کا عرصہ گذرا ہو گا کہ پٹیالہ کے مشہور مدبر و رکن
ریاست مرحومی جناب خلیفہ سید محمد حسین خاں صاحب بالقابہ نے ایک صحبت میں
فرمایا تھا کہ ملک میں ایک ایسا رسالہ جاری ہونے کی سخت ضرورت ہے جس کا مقصد
براہ راست محض اردو زبان کی خدمت اور اُس کے لٹریچر کی اصلاح ہو۔ اگرچہ اُس
وقت تمام حاضرین نے بالاتفاق اس ضرورت کو تسلیم کیا تھا، مگر گذشتہ دس سال
میں نہ اُس پر کچھ عمل درآمد ہوا اور نہ کسی کو وہ بات یاد رہی۔ مگر اصلی اور حقیقی ضرورتوں
سے کیسی ہی بے اعتنائی یا بے پروائی کیجائے وہ کبھی نہ کبھی ضرور پوری ہو کر رہتی ہے۔
کوئی نہ کوئی خدا کا بندہ بغیر کسی کی تحریک کے خود بخود اس کے پورا کرنے کو کھڑا ہو جاتا ہے۔
چنانچہ یہ رسالہ جس کا نام "اردو" رکھا گیا ہے اسی ضروری مقصد کے لئے جاری کیا گیا
ہے اگرچہ ابھی تک اُس کا صرف ایک نمبر شائع ہوا ہے جس سے اُس کے مستقبل کی
نسبت کوئی صحیح رائے قائم نہیں ہو سکتی لیکن جیسا کہ کہا گیا ہے "سالے کہ نکوست
از بہارش پیداست"، ہم کو قوی امید ہے کہ یہ رسالہ مقبول خاص و عام ہو گا۔ اول

نہیں ہو اگر زندگی نے وفا کی اور خدا کو منظور ہوا تو کسی دوسرے موقع پر اس باب میں اپنے مفصل خیالات ظاہر کئے جائیں گے۔ مختصر یہ ہو کہ شاہ صاحب کے خاندان کے بعد ہندوستان کے عام مسلمانوں کے لئے قرآن کریم کی جو خدمت اس بزرگ سے بن آئی ہمارے نزدیک آج تک کسی سے بن نہیں آئی۔ ہمارے علمائے دین سے نہایت تعجب ہو کہ اکثر صاحبوں نے ترجمہ مذکور پر اعتراض کرنے میں تو کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا (ممکن ہے کہ بعض صحیح ہوں) اور اکثر مدعیان ترجمہ نے اُس سے پیٹ بھر کر فائدہ اٹھایا مگر بدقسمتی سے کسی کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اُس مرحوم کی کوشش کی داد دینا تو در کنار ایک حرف بھی اُس کے حق میں کسی کے منہ سے نکلتا۔ اِنَّ ھٰذا لشیٔ عجاب۔

اب میں مصنف حیات النذیر کی شان میں چند الفاظ لکھتا ہوں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ کتاب نہایت لیاقت اور خوش سلیقگی سے لکھی گئی ہو۔ باوجودیکہ راقم کی حالت مدت سے مطالعہ کی اجازت نہیں دیتی پھر بھی کتاب کی دلچسپی اور ہیرو کی عظمت نے مجبور کر دیا کہ جہاں تک ممکن ہو اس معزز لائف کو خود پڑھوں یا اوروں سے پڑھوا کر سنوں۔

اس کتاب کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ وہ اقتباسات ہیں جو مولانا کی کتابوں یا اُن کے خطوں سے مصنف نے جابجا انتخاب کئے ہیں۔ مولانا مرحوم کی عام تحریروں میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ اُن کا کوئی بیان شروع ہونے کے بعد جب تک کہ ختم نہ ہو جائے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ پس جبکہ عام تحریروں کا یہ حال ہے تو جو اقتباسات مصنف نے خاص توجہ کے ساتھ مولانا کی کتابوں سے انتخاب کئے ہیں ظاہر ہے کہ وہ کس قدر دلاویز اور دلکش ہوں گے۔ اس سے زیادہ ہم مولانا کی طرز تحریر کے متعلق اس ریویو میں بحث کرنا نہیں چاہتے۔ صرف اس قدر کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ہر مشکل سے مشکل اور آسان سے آسان مطلب کے بیان کرنے پر جو غیر معمولی قدرت اس شخص کو اپنے سٹائل میں تھی وہ اُس قادر الکلامی سے کسی طرح کم نہ تھی جو سرسید مرحوم

ہو چکے ہیں اور کل اڈیشنوں کی کچھ اوپر اڑتالیس ہزار جلدیں اب تک فروخت ہو چکی ہیں اور اُس کی مانگ یوماً فیوماً زیادہ ہوتی جاتی ہے اس سے بھی زیادہ اُس کی قبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ کو اس وقت سوا سو برس کا عرصہ گذر چکا ہے اور جب مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمے کی اشاعت شروع ہوئی اُس وقت شاہ صاحب کے ترجمے کو ایک سو نو برس گذر چکے تھے، اس عرصہ میں اہل سنت میں سے بظاہر کسی عالم کو نیا ترجمہ کرنے کا خیال پیدا نہیں ہوا۔ مگر جب ترجمہ نذیریہ کی اشاعت روز بروز بڑھنے لگی اور ملک کے ہر طرف سے اُس کی مانگ آنی شروع ہوئی دفعتاً بہت سے اصحاب قرآن مجید کی خدمت یعنی مولوی نذیر احمد کی تقلید پر کمربستہ ہو گئے اور چند سال کی مدت میں متعدد جدید ترجمے چھپ کر تیار ہو گئے۔ مگر یہ معلوم نہ ہوا کہ ان جدید ترجموں نے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچایا؟ شاہ صاحب کے ترجمے سے بہ سبب اس کے کہ اُن کے زمانے میں اُردو زبان اور اُس کی بول چال اور مترجمی قرآن کی ابتدائی حالت تھی، قرآن مجید کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں نہ آتا تھا مگر ترجمۂ نذیریہ کی بامحاورہ اردو اور طرز ادائے مطلب کی مدد سے قرآن کا مطلب پڑھے لکھے اور ان پڑھ سب بخوبی سمجھنے لگے اور کلام الٰہی سے ہر شخص اپنی اپنی سمجھ کے موافق لذت اور فائدہ اٹھانے لگا۔ لیکن ان ترجموں نے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کیا کہ کہیں کہیں ترجمۂ نذیریہ کے الفاظ بدل دئے جن کے بدلنے کی کوئی وجہ اس کے سوا معلوم نہیں ہوتی کہ چند الفاظ کی تبدیلی سے ایک مستقل مترجم قرآن کہلانے کا ممتاز درجہ حاصل کر سکیں یا اس بہانے سے رجسٹری شدہ ترجمۂ نذیریہ کے چھاپنے کے مجاز ہو جائیں۔ مگر جہاں تک ہم کو معلوم ہے نہ اُن کو پبلک میں ممتاز درجہ حاصل ہوا اور نہ اُن کے ترجموں کو وہ حسن قبول نصیب ہوا جس سے اُن کو کوئی مالی فائدہ پہنچ سکتا۔ بہر حال مولانا نذیر احمد مرحوم نے قرآن مجید کی جو خدمت کی ہے اُس کی مفصل کیفیت بیان کرنے کا یہ موقع

حیات النذیر

مؤلفہ سید افتخار عالم مارہروی مرحوم

(منقول از حیات النذیر صفحہ ۹ تا ۱۲)

میں مصنف حیات النذیر کی اس خاص عنایت کا شکریہ تہ دل سے ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھکو مولانا کی سوانح عمری کے مطالعہ کا حد سے زیادہ مشتاق دیکھ کر اپنی کتاب پہلے اس سے کہ چھپ کر بہمہ جہت تیار ہو جائے، خاکسار کو عنایت کی ہے۔ ظاہرا مصنف نے حیات النذیر کی ترتیب مولانا کی زندگی ہی میں شروع کر دی تھی۔ ورنہ اُن کی وفات کے بعد جس کو بہت زمانہ نہیں گذرا ایسی مفصل و مشرح لائف کا سرانجام کرنا نہایت دشوار تھا۔ بہرحال مصنف نے اس کتاب کے لکھنے سے ایک ایسا فرض ادا کیا ہے کہ جب تک وہ ادا نہ کیا جاتا، میرے نزدیک قوم کا کوئی اہل قلم اس بار سے سبکدوش نہ ہو سکتا تھا۔ مولانا نذیر احمد نے اپنی عام تصنیفات سے جو احسان اُردو لٹریچر پر کیا ہے اور اپنے جادو اثر لکچروں سے جو سکہ جمہور کے دلوں پر بٹھایا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ خصوصاً قرآن مجید کی خدمت کے لحاظ سے جو امتیاز انھوں نے ہندوستان کے علمائے اسلام میں حاصل کیا ہے اُس کا صحیح صحیح اندازہ لوگ اُس وقت کر سکیں گے جب اُن کی وفات پر ایک معتدبہ زمانہ گذر جائیگا اور معاصرین کا دور ختم ہو کر حب و بغض کے جذبات فرو ہو جائیں گے۔

قرآن مجید کا ترجمہ جو انھوں نے کیا ہے اُس کی عام مقبولیت کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اُس کی اشاعت کو سولہ برس سے زیادہ عرصہ نہیں گذرا۔ اس قلیل عرصہ میں اُس کے گیارہ ایڈیشن مختلف صورتوں میں چھپ کر شائع

مجھے امید ہے کہ مکتوباتِ امیر کی اشاعت خاص کر ان لوگوں کے لئے جو حضرت امیر احمد
مینائی سے عقیدت رکھتے ہیں اور جن کی تعداد ہندوستان میں کچھ کم نہیں ہے ایک
نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگی۔

خطوط امیر احمد مینائی

(منقول از خطوط امیر احمد مینائی صفحہ ۱-۳)

منشی امیر احمد مینائی لکھنؤ کے رہنے والے مولوی کرم محمد صاحب مینائی کے فرزند ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۰ء) میں انتقال کیا۔ اعلیٰ درجہ کے شاعر اور ادیب تھے۔ یہ کتاب منشی صاحب کے اُن خطوط کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً انھوں نے اپنے شاگردوں، عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں کو لکھے۔ یہ خطوط منشی صاحب کے شاگرد رشید مولوی محمد احسن اللہ خاں ثاقب نے عرصہ دراز کی تلاش کے بعد جمع کرکے نومبر ۱۹۱۰ء میں شائع کئے۔

کتاب مندرجہ عنوان کا مسودہ جو میرے لائق دوست خواجہ محمد احسن اللہ خاں ثاقب مدیر رسالہ مرحوم "قند پارسی" نے مرتب کیا ہے، میری نظر سے گذرا۔ خواجہ صاحب موصوف جناب منشی امیر احمد صاحب مغفور سے نسبت تلمذ رکھتے ہیں۔ اُن کا شاگردانہ خلوص اس بات کا مقتضی تھا کہ اپنے واجب التعظیم استاد کا حق شاگردی کسی مناسب پیرائے میں ادا کریں۔ اول انھوں نے ان کی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ کیا مگر بعض اسباب سے جن کا ذکر انھوں نے دیباچہ میں کیا ہے، میٹیریل بہت کم میسر آیا۔ پھر ان کے مکتوبات جمع کرنے کی طرف توجہ کی، لیکن باوجود اس کے کہ ایک عالم سے جناب ممدوح کی خط و کتابت تھی خطوط بھی بقدر توقع بہم نہ پہنچے۔ بایں ہمہ ایک معتد بہ مقدار مکاتیب کی جمع ہوگئی۔

اگرچہ ایک ایسے نامور بزرگ کے حالات لکھنے کے لئے یہ مختصر ذخیرہ کافی نہ تھا،

ہوتا بلکہ اس میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہتا ہے انھوں نے ابھی ایک اور نادر کتاب موسوم بہ غرائب الجمل ۱۸۰ صفحہ پر چھاپ کر شائع کی ہے جو فن جمل میں جس کی رو سے واقعات کی یادداشت کے لیئے تاریخی مادے استخراج کیئے جاتے ہیں) جہاں تک کہ راقم کو معلوم ہے ایک بیمثل ولاجواب تالیف ہی۔

اس کے سوا کئی سال سے آپنے ایک فارسی ڈکشنری بھی لکھنی شروع کر رکھی ہی۔ جس میں علاوہ فارسی الفاظ و محاورات کے ہر فارسی لفظ یا محاورہ کی تحقیق کے بعد جو محاورہ اُس کی جگہہ اُردو میں مستعمل ہوتا ہے اُسے بھی ساتھ کے ساتھ بیان کیا ہے اور دونوں زبانوں کا کوئی لفظ یا محاورہ (الا ماشاء اللہ) ایسا نہیں لکھا جس پر اہل زبان کے کلام سے ایک سند یا متعدد سندیں پیش نہ کی گئی ہوں۔ ظاہر ہے کہ معزز مصنف نے یہ ایک ایسا کام شروع کیا ہے جس کا پورا ہونا نہایت دشوار معلوم ہوتا ہے۔ حیدرآباد میں انھوں نے اس کتاب کا اندازہ فرما کر راقم سے کہا تھا کہ اگر وہ ختم ہوگئی تو ۲۸ جلدوں میں آئے گی اور ہر ایک جلد سات آٹھ سو صفحے سے کم نہ ہوگی۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ یہ کتاب میری زندگی میں ختم ہوتی نظر نہیں آتی لیکن خدائے تعالیٰ نے اُن کی ذات میں وہ تمام صفات جمع کر دیئے ہیں جو بڑے بڑے مصنفین میں سُنی اور دیکھی گئی ہیں۔ ہمت، جفاکشی، ضبط اوقات، حسن انتظام، فضول کاموں سے نفرت، سلیقہ، ستھرائی اور اسی قسم کے دیگر اوصاف جو اُن میں دیکھے گئے ہیں وہ بہت ہی کم لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔

ہم کو خدا کی ذات سے امید ہے کہ وہ اُن کی عمر میں اُن کے اوقات میں اور اُن کے مساعی جمیلہ میں برکت دے گا اور ان کو اپنے اس ارادے میں کامیاب فرمائے گا۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

میں بھی یہی نسبت ہے۔ دو معین المہام مسلمان ہیں تو ایک کرسچین اور ان پر وزیر اعظم ہندو۔ یہی وجہ ہے کہ جو اتحاد و یک جہتی ریاست ممدوح کے ہندو مسلمانوں میں پائی جاتی ہے وہ کسی ہندوستانی ریاست میں دیکھی یا سنی نہیں گئی۔ اسلامی پیشواؤں کی نذر و نیاز کی تقریبیں اور عشرہ محرم الحرام میں عزاداری کے مراسم ہنود کے گھروں میں اسی طرح جاری ہیں جیسے مسلمانوں کے گھروں میں۔

علی ہذا القیاس جاتراؤں میں مسلمانان ریاست برابر ہندوؤں کا ساتھ دیتے ہیں جوبلی چہل سالہ کے موقع پر ہم نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ خوشی اور شادمانی کے اظہار میں ہر ایک مذہب و ملت کی جماعتیں ایک دوسرے پر سبقت کرنی چاہتی تھیں اور اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جس طرح ہر ایک قوم کے مردوں کی طرف سے پیشگاہ حضور نظام میں بے شمار سپاس نامے اور اڈریس پیش ہوئے تھے اسی طرح عیسائی اور پارسی عورتوں نے بھی اس خوشی میں حصہ لیا تھا۔

اگرچہ یہ کتاب ایک مختص المقام مضمون (یعنی ریاست حیدر آباد کے اقسام عطیات) پر مشتمل ہے لیکن درحقیقت وہ عام ہندوستانیوں کے لئے ہے جو مورخانہ مذاق رکھتے ہیں ویسی ہی دلچسپ اور پر لطف ہے جیسی اہل دکن کے لئے۔

میں خیال کرتا ہوں کہ سررشتہ تحقیقات عطیات جو حضور آصفجاہ سادس (خلد اللہ ملکہ) کے عہد میمنت میں قائم ہوا ہے، اگر معزز مصنف کو ایک معتد بہ مدت تک اس سے خاص تعلق نہ رکھا ہوتا اور ان کی ہمہ گیر طبیعت میں اپنی ہر قسم کی معلومات سے فائدہ اٹھانے اور عمدہ نتائج پیدا کرنے کا مادہ نہ ہوتا تو وہ اس مضمون پر ایسی دلچسپ اور پر لطف کتاب لکھنے میں مشکل سے کامیاب ہو سکتے تھے۔

نواب عزیز جنگ بہادر کی تصنیفات کا سلسلہ مذکورہ بالا کتابوں ہی پر ختم نہیں

(جو خاص مسلمانوں سے علاقہ رکھتے ہیں) صرف خال خال ہیں۔ برخلاف
اس کے اگنی ہوتر، ننداد یب اور اساڑھی کی معاشیں (جو ہنود سے متعلق
ہیں) کثرت سے جاری ہیں"
اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ

"ہمارا حتمی دعویٰ ہے کہ ہندوستان کی کل دیسی ریاستوں میں سے ایک
ریاست بھی سلطنت آصفیہ کے ساتھ اس خاص صفت بے تعصبی میں
ہم قدم نہ ہو سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے رحم دل رئیس پر جس طرح
اُس کی مسلمان رعایا فدا ہے اُسی طرح اُس کی ہندو رعایا جاں نثار ہے۔
یہ صفت اس خاندان میں سلف سے چلی آتی ہے اور یہ پرداخت صرف
لفظوں ہی میں نہیں ہے بلکہ اس کی مادی شہادت سررشتۂ عطیات
کی سیر کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ہمارا مالک جس طرح اسلامی تقاریب
میں نذریں پیش کشیں قبول کرکے مسلمانوں کو عزت بخشتا ہے اسی طرح
اپنی ہندو رعایا کی مذہبی تقاریب میں اُن کی نذریں اور تحفے قبول فرماتا
ہے۔ اگر کسی نووارد سجادہ نشین درگاہ کی مہمانی میں کوتاہی نہیں
ہوتی تو ساتھ ہی کسی سیاح مہاتما اور مہابیر کی خدمت اور امداد سے
بھی کنارہ کشی نہیں کی جاتی۔ حیدرآباد کے چار صوبوں میں ایک کا گورنر
مسلمان تو دوسرے کا گورنر ہندو ہے اور باقی دو کے گورنر بھی غیر مسلمان
ہیں۔ معتمد مال کرسچین ہے تو معتمد عدالت مسلمان اور معتمد پولٹیکل پارسی
تعلقہ داران اضلاع میں ہندو اور مسلمان دونوں دوش بدوش ہیں
ہائی کورٹ کے نظما میں ہندو اور مسلمانوں کا جوڑ لگا ہوا ہے۔ نظمائے
صوبہ کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ججان و مددگاران عدالت اور مجسٹریٹوں

اُن کی گذراوقات کے لئے عطا فرمائی ہیں اور اُن کے صدقۂ جاریہ سے
صفحہ روزگار پر اُن کی اعلیٰ یادگار قائم ہے اور بعض صاحبان تاریخ نے
کہیں کہیں اس کا اجمالی ذکر بھی کیا ہے۔ لیکن ہم یہ نہ جانتے تھے کہ اس
کی کیفیت اس قدر مبسوط اور دلچسپ ہی کہ اُس سے فن تاریخ کا ایک
مکمل ذخیرہ ہاتھ آسکتا ہے۔

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ مصنف ممدوح اُن معمولی مضامین پر بہت کم قلم اٹھاتے
ہیں جن پر اُن کے پہلے لوگ طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ یہ کتاب بھی اسی قبیل کی ایک تصنیف
ہے۔ ممالک دکن میں معاشداروں کا ایک جم غفیر ہے جس کو شاہانِ سلف سے وقتاً
فوقتاً کثیر المقدار اور کثیر التعداد انعامات وجاگیرات وغیرہ بطور مدد معاش کے عطا
ہوتی رہی ہیں۔ اس کتاب میں مصنف نے انھیں انعامات وجاگیرات کو ایک
خاص ترتیب اور نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کتاب کی اصلی حقیقت اور
مصنف کی عرق ریزی اور تحقیقات کا حال تو بغیر اس کے کہ اس کو اول سے آخر تک
بغور مطالعہ کیا جائے معلوم نہیں ہو سکتا۔ مگر اس میں ایک بات ایسی ہے جس کے
بالاجمال بیان کر دینے سے کتاب کی عظمت بخوبی منکشف ہو سکتی ہے۔ اس کتاب
کے ورق ورق اور صفحہ صفحہ سے ریاست حیدرآباد کی عام فیاضی، بے تعصبی اور
انسانی ہمدردی کا ایسا ثبوت ملتا ہے جو شاید دنیا کی کسی حکومت یا سلطنت میں
نہیں مل سکتا۔ ہنود و مسلمانوں کے معابد اور اُن کی مذہبی رسوم میں جو امداد اس
ریاست سے ہوتی ہے اُس کے متعلق معزز مصنف کا بیان ہے کہ

"ان اقسام عطیات سے جو خاص کر اس باب میں بیان ہوئی ہیں، ہم
نے مسلمانوں کی معاش کی تعداد اور مقدار بہ نسبت معاشہائے ہنود
کے بہت کم پائی ہیں۔ ختم خوانی، اعتکاف اور چلہ کشی کی معاشیں

ہم نے تاریخ کے سیکڑوں ہزاروں ورق اُلٹے ہیں اور مدت تک جستجو کی ہے کہ
قدیم زمانے کے ہر قسم کے طریقۂ کارروائی سے واقف ہوں اور گو ہم نے چند
معمولی باتوں کو آب و رنگ دے کر ناظرین کو محظوظ کر لیا ہے لیکن انصاف
یہ ہے کہ جو کچھ ڈھونڈ کر پا سکے وہ من میں چھٹانک بھی نہ تھا۔ نواب عزیز جنگ
بہادر مبارکباد کے مستحق ہیں کہ "انھوں نے صرف حسابی سیاق کے متعلق
۱۲۶ صفحہ کی کتاب تیار کر دی جو عجیب و غریب تحقیقات سے لبریز ہے۔"
اب کتاب کے دیکھنے سے سلاطین تیموریہ کے زمانے کا طریقہ سیاق اس
طرح آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے کہ گویا ہر قسم کے دفاتر ہمارے سامنے موجود ہیں۔ یہ
نادرالوجود کتاب سرکار نظام کے سررشتۂ تعلیم کے کورس میں داخل ہے اور ہندوستان
کے اکثر حصوں میں اس کی قدر ہوئی ہے۔

مصنف ممدوح جہاں تک دیکھا جاتا ہے معمولی اور پامال مضامین پر ہاتھ
نہیں ڈالتے بلکہ ہمیشہ اچھوتے مضامین پر جن کی ضرورت محسوس کرتے ہیں قلم
اُٹھاتے ہیں۔

انھوں نے کاشت خرما، کاشت انگور، کاشت انجیر اور کاشت ترکاری
پر بہت بسط کے ساتھ مفید کتابیں لکھی ہیں جن میں سے اول کی دونوں پر سرکار عالی
سے معقول انعام عطا ہوا ہے اور گورنمنٹ آف انڈیا کے ایگریکلچر آفس نے اُن پر
نہایت تعریف کے ساتھ ریویو لکھا ہے۔ ایک اور کتاب فن فلاحت ہی کے متعلق موسوم
علاج النباتات زیر تصنیف ہے جس میں نباتات کی بیماریوں اور ان کے معالجات
کا بیان ہے اور جو عنقریب چھپنے والی ہے۔

سنہ ۱۳۲۲ ہجری میں مصنف ممدوح نے ایک اور مبسوط کتاب تقریباً پونے چھ سو
صفحے کی فن تاریخ میں شائع کی تھی جو اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل اچھوتی ہے اور

رسالہ "آفتاب"

(منقول از رسالہ آفتاب جلد ۲ نمبر ۱ بابت فروری ۱۹۰۷ء صفحہ ۲)

"آفتاب" نامی ایک ماہوار رسالہ جھالرا پاٹن (راجپوتانہ) سے سید محمد حسین صاحب رضوی کی زیرادارت فروری ۱۹۰۶ء سے جاری ہوا تھا۔ مندرجہ ذیل خط ریویو کے طور پر مولانا نے اڈیٹر کو لکھا تھا۔ مولانا اُس وقت حیدرآباد میں تھے اور آپ نے وہیں سے یہ ریویو لکھ کر بھیجا تھا۔

مکرمی

رسالہ آفتاب کے دو نمبر پہنچے۔ اُن کو دیکھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ اُس کو پڑھ کر بے انتہا مسرت حاصل ہوئی کیونکہ ہمارے رئیسوں کا اس طرف متوجہ ہونا اور ایسی لیاقت سے علمی مضامین لکھنا ہندوستان کے بھلے دن آنے کی امید ہے۔ بابو امبالال صاحب کا مضمون "تعلیم" پر اور آپ کا مضمون "تعصب" پر بھی بہت عمدہ مضمون ہیں۔ خدا سے امید ہے کہ آفتاب ملک میں چمکے گا۔ دل سے دعا کرتا ہوں کہ آپ کامیاب ہوں اور آفتاب کی روشنی تمام راجپوتانہ میں پھیلے۔

رسالہ ”اتحاد“

(منقول از رسالہ اتحاد جلد ا نمبر ۳ بابت یکم مئی سنہ ۱۹۰۱ء صفحہ ۱)

مولوی عبدالحلیم شرر مرحوم نے ”اتحاد“ کے نام سے ایک پندرہ روزہ رسالہ لکھنؤ سے جاری کیا تھا جس کا واحد مقصد مسلمانوں اور ہندوؤں کو باہم شیر و شکر کرنا اور اُن میں اتحاد و اتفاق کی بنیاد ڈالنا تھا۔ رسالہ کا پہلا پرچہ یکم اکتوبر سنہ ۱۹۰۰ء کو شائع ہوا تھا نیچے کا ریویو اسی کے متعلق ہے۔

جس مقصد کے لئے یہ رسالہ جاری کیا گیا ہے اس کو میں ایسا ضروری اور اہم جانتا ہوں کہ میرے نزدیک ہندوستان کے حق میں اس سے زیادہ مہتم بالشان کوئی مقصد نہیں ہو سکتا۔

فلسفۂ تعلیم

(منقول از فلسفۂ تعلیم مطبوعہ ۱۹۰۴ء صفحہ ۳۰۰)

میں نے انگلستان کے نامور حکیم ہربرٹ سپنسر مرحوم کی بے مثل کتاب "ایجوکیشن" کا ترجمہ جو "انجمن ترقی اُردو" کی فرمائش سے مولوی خواجہ غلام الحسنین پانی پتی نے کیا ہے۔ مختلف مقامات سے خود بھی دیکھا اور مترجم موصوف نے بھی اُس کا بہت بڑا حصہ مجھے پڑھ کر سنایا۔ اور جس احتیاط اور صبر کے ساتھ اُنھوں نے اس ترجمہ کو پورا کیا ہے اُس سے بھی میں بخوبی واقف ہوں۔

اگرچہ اس ترجمہ کی نسبت، جو انگریزی سے اُردو زبان میں کیا گیا ہے ایک ایسا شخص جو انگریزی زبان سے بالکل نابلد ہو رائے دینے کا استحقاق نہیں رکھتا، لیکن وہ اس بات کا اندازہ کرسکتا ہے کہ مترجم نے اپنے ترجمے کے ذریعے سے مصنف کے عمیق و دقیق خیالات کو کہاں تک اُردو داں پبلک کے فہم کے لائق کر دیا ہے اور جس زبان میں اصل کتاب کے مضامین ادا کئے گئے ہیں وہ کہاں تک سائنس کے بیان کے لئے موزوں اور مناسب ہے۔ میرے نزدیک ان دونوں باتوں کے لحاظ سے مترجم کو توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی ہے جس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اُنھوں نے ترجمے کی تکمیل اور زبان کی صفائی اور شستگی میں اپنے اصلی فرائض سے بہت زیادہ اور انجمن کی امیدوں سے بمراتب بڑھ کر عرق ریزی و جانفشانی کی ہے۔

درحقیقت یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ انجمن کو اس کتاب کے ترجمے کے لئے ایک ایسا شخص مل گیا جو قطع نظر انگریزی، عربی اور فارسی کی جامعیت کے فطرۃً علمی مشاغل پر فریفتہ اور اپنے فرائض کو عاشقانہ دلچسپی اور شغف کے ساتھ انجام دینے والا ہے فقط

اس کے سوا کوئی کام صرف اس وجہ سے مذموم نہیں ٹھہر سکتا کہ بعض اشخاص اُس کو بُری طرح کرتے ہیں۔

کتاب کا مطالعہ جو بالاتفاق ایک نہایت مفید اور عمدہ مشغلہ ہے وہ صرف اس وجہ سے قابلِ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ بعضے لوگ اُسی کے ہو رہتے ہیں اور تمام دینی اور دنیوی کاموں کو مطالعہ کے شوق پر قربان کر دیتے ہیں۔ اس کتاب کی نسبت صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ جو کچھ اس کے متعلق لالہ جیون لال صاحب منیجر امپیریل بک ڈپو چاندنی چوک بازار دہلی نے اپنے اشتہار میں لکھا ہے اُس میں سرمو مبالغہ نہیں کیا گیا، بلکہ جس طرح اکثر عمدہ کتابوں کے اشتہارات میں بسبب اختصار کے اُن کتابوں کی اصلی خوبیاں پوری پوری بیان نہیں ہو سکتیں اسی طرح صاحب منیجر امپیریل بک ڈپو کا اشتہار کتاب معلم الشطرنج کی بہت سی خوبیاں بیان کرنے سے قاصر رہا ہے۔ لیکن اس کتاب میں ایک بات کی کسر معلوم ہوتی ہے یعنی جبکہ اس میں بہت سے یورپین شاطروں کے کمالِ شطرنج بازی کا ذکر جا بجا کیا گیا ہے تو مقتضائے مقام یہ تھا کہ ہندوستان کے نہایت نامور اور باکمال شاطروں کا بھی کسی قدر تذکرہ کیا جاتا۔ خصوصاً انیسویں صدی کے مشہور شاطر مثل کرامت علی خاں و میرزا رحیم الدین حیا و امام علی خاں وغیرہ ہم ضرور اس بات کے مستحق تھے کہ جو کتاب ہندوستان کی زبان میں ایک ہندوستان ہی کے ایجاد کئے ہوئے کھیل پر لکھی جائے، اُس میں اُن کی خاص خاص بازیوں اور نقشوں کا ذکر کیا جائے۔ لیکن حق یہ ہے کہ ہمارے لٹریچر میں کوئی ذریعہ ایسا موجود نہیں ہے جس سے ہندوستانی شاطروں کی کسی بازی یا کسی نقشے کا سُراغ لگانا ممکن ہو۔ جو شاطر مر گیا اُس کی بازیاں اور اُس کے نقشے بھی اُسی کے ساتھ مر گئے۔ البتہ ہمارے عزیز دوست راجا بابو صاحب نے اردو لٹریچر میں ایک ایسی مثال قائم کی ہے کہ اگر اُس کی پیروی کی گئی تو ہمارے آئندہ شاطروں کے عمدہ عمدہ نقشے آینوالی نسلوں کے لئے محفوظ رہ سکیں گے۔

دلّی میں عبدالحکیم نامی ایک مشہور غائب باز تھا جس کو ہم نے خود حاضر و غائب دونوں

معلم الشطرنج

(از معلم الشطرنج مطبوعہ ۱۹۰۱ء)

اس کتاب کو بقدر ضرورت میں نے مختلف مقامات سے دیکھا۔ اگرچہ میرا یہ منصب نہیں ہے کہ ایک ایسی کتاب کی نسبت جس کا موضوع فن شطرنج بازی ہو اس کے مضمون کی حیثیت سے کچھ چون وچرا کر سکوں، کیونکہ یہ درحقیقت ایک ماہر و مشاق شاطر کا کام ہے جو اس فن میں یدطولیٰ رکھتا ہو۔ لیکن چونکہ یہ کتاب اُردو زبان میں لکھی گئی ہے اس لئے ہر شخص جو اُردو زبان کو سمجھ سکتا ہو وہ کم سے کم اس بات کا حق رکھتا ہے کہ مصنف کی طرزِ تصنیف وطرز بیان یا کتاب کے مفید وغیر مفید ہونے کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرے۔

جہاں تک مجھکو معلوم ہے آج تک کوئی کتاب ہماری زبان میں شطرنج پر ایسی جامعیت کے ساتھ نہیں لکھی گئی اور اس فن کے متعلق اس قدر معلومات کا ذخیرہ ہندوستانیوں کے واسطے کبھی جمع نہیں کیا گیا۔ ممکن ہے کہ بعض ہموطن اس کتاب کے مفید ہونے میں تامل کریں۔ مسلمان تو اس وجہ سے کہ اُن کے مذہب میں لہو ولعب میں مشغول ہونا ممنوع ہے اور ہندو اس وجہ سے کہ جن لوگوں کو اس کھیل کا چسکا پڑ جاتا ہے وہ اکثر اپنے ضروری اور بڑے بڑے فرائض کو شطرنج بازی پر قربان کر دیتے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات اُن کو کھانے پینے بلکہ اپنے آپ کی بھی خبر نہیں رہتی لیکن لعب کا اطلاق اُن کھیلوں پر ہوتا ہے جو کسی عمدہ مقصد کے لئے نہیں بلکہ صرف تضیع اوقات کے طور پر کھیلے جاتے ہیں پس شطرنج اگر خاص اوقات میں اس غرض سے کھیلی جائے کہ مآل اندیشی اور تدبر کی عادت پڑے اور دماغ میں سوچنے اور غور کرنے کا ملکہ پیدا ہو تو ہرگز لعب میں شمار نہیں ہو سکتی۔

کے ساتھ شاید کچھ دلچسپی ظاہر نہ کریں مگر جو لوگ پرانے مذاق کے متوالے ہیں اور اب تک
اُنھیں پر ملک کی شاعری کا دار و مدار ہے اُن کے لئے یہ دیوان ایک نعمت غیر مترقبہ ہو۔
جو ہمارے معزز دوست کی بدولت ملک میں عام طور پر شائع ہوا ہے اور مطبع رفاہ عام لاہور
سے بہت ارزاں قیمت پر بحساب ۱۲ر فی جلد مل سکتا ہے۔

ظہیر اور مرزا سالک کے ساتھ شریک ہوکر ہم نے اُن کی ہم طرحی کی عزت حاصل کی تھی۔ کبھی کبھی نواب مرزا خاں داغ بھی رامپور سے آکر ان مشاعروں میں مشتاقوں کی سامعہ نوازی کرتے تھے اور شہر کے اکثر شریف زادے اور امیرزادے جن میں سے بہت سے چل بسے اور خال خال باقی ہیں۔ ہر طرح کی زمینوں میں زور طبیع دکھاتے تھے۔ مرزا غالب مرحوم و مغفور کا اخیر زمانہ تھا۔ غالباً وہ خود کبھی ان جلسوں میں نہیں آئے مگر اُن کی دیکھی ہوئی اور اصلاح دی ہوئی غزلیں برابر آتی تھیں اور پڑھی جاتی تھیں۔ گو اب خیالات میں انقلاب عظیم پیدا ہو گیا ہے اور پچھلی حالت کے تصور سے شرم آنے لگی ہے مگر گذرا ہوا زمانہ خواہ بچپن کی نادانی کا زمانہ ہو یا جوانی کی بدمستی کا، اُس کی یاد میں عجیب لذت رکھی گئی ہے کہ کوئی چیز اُس کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ پچھلا زمانہ جیسا کہ کہا گیا ہے بعینہٖ نمائشِ سراب کا حکم رکھتا ہے کہ جب پاس تھے تو ریت کے ٹیلوں کے سوا کچھ نہ تھا مگر دور سے وہی ٹیلے دریائے موّاج کی طرح لہریں مارتے نظر آتے ہیں۔ وہی مشاعرے جو اب بچوں کا کھیل معلوم ہوتے ہیں اگر اُن کا پھر ہاتھ آنا ممکن ہو تو کون ایسا بے دید اور طوطا چشم ہوگا جو نئی روشنی کو اُس قدیم تاریکی سے بدلنے پر فی الفور آمادہ نہ ہو جائے۔ سچ ہے ؎

گئے بڑھنے جب سے کہ ہوش و خرد لگیں ساتھ بڑھنے پریشانیاں
بڑھاپے کی دانائی لے کر کوئی بدل دے وہ بچپن کی نادانیاں

یہ دیوان جس کا نام معزز اشاعت کنندہ نے "نظم دلفروز" رکھا ہے اور ہم اُس کو اس لحاظ سے کہ وہ صاحب دیوان کی جدائی کا داغ تازہ کرنے والا ہے "نظم دلگداز" کہتے ہیں، شاید نئے بگڑے ہوئے شاعر اُس کی جیسی کہ چاہئے قدر نہ کریں اور ایک نئے مسلمان کی طرح جس کا قصائی کی دوکان کے سوا کہیں جی نہیں لگتا، اس دیوان

اس کلیہ کو کہ الکاتب جاہل غلط ثابت کر دیا تھا۔ خصائل و عادات کے لحاظ سے میں ان کو مستثنیٰ لوگوں میں شمار کرتا تھا۔ سادگی و پرہیزگاری، آزادہ روی و خودداری، ہر حال میں خوش رہنا اور اُس اشراف گردی کے زمانہ میں پاسِ وضع کو ہاتھ سے نہ دینا، اُن کی خاص خصلتیں تھیں۔ انھوں نے اُس وقت جبکہ خدا کے سوا کوئی سہارا باقی نہ رہا تھا اپنے دست و بازو پر بھروسا کیا اور جس جان نے بے فکری اور فارغ البالی کے سوا کچھ نہ دیکھا تھا، اُس کو فوراً محنت و مشقت میں ڈال دیا اور جوانمردوں کی طرح اہل و عیال کے لئے دوڑ دھوپ اور تگ و دو میں بسر کی۔ بزرگوں کے کمالات جو اگلے زمانے میں نام و نمود اور عزت اور شرف کے ذریعے خیال کئے جاتے تھے، جب وقت پڑا تو اُن کو بے تکلف ذریعۂ معاش گردانا۔ اور جواہر گراں بہا کو جبکہ بازار میں کوئی جوہری نظر نہ آیا کنبے کے نان و نفقہ پر قربان کر دیا۔ اللہ اللہ اُس مرحوم جامعِ اوصافِ کمال کی تصویر آج پندرہ برس بعد پھر آنکھوں کے سامنے آئی ہے۔

ہمارے عزیز دوست لالہ سریرام ایم۔ اے۔ خلف الرشید آنریبل رائے بہادر لالہ مدن گوپال ایم۔ اے۔ بیرسٹرایٹ لا رئیس دہلی نے سید انور مرحوم کا دیوان چھپوا کر ازراہِ محبت ہمارے پاس بھیجا ہے، گویا مدت کے بچھڑے ہوئے دوست کو دوست سے ملایا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ اپنے عزیز دوست لالہ سریرام کی اس مہربانی اور یادآوری کا شکریہ ادا کریں یا اُن کی اس کوشش اور توجہ کی داد دیں جو انھوں نے اپنے وطن کے ایک صاحب کمال کی یادگار قائم کرنے اور اُن کے نام زندہ کرنے میں فرمائی، یا اُس احسان کا ذکر کریں جو عزیز موصوف نے اس دیوان کی اشاعت سے سید انور کے دوستوں اور عزیزوں پر کیا ہے، یا اُس کیفیت کو بیان کریں جو اس دیوان کو دیکھ کر ہمارے دل پر گذری ہے۔ اس دیوان نے وہ قدیم کوچہ ہم کو پھر یاد دلایا ہے جس کی تیس برس خاک چھاننے کے بعد زمانہ کی زبردستی سے اُس کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ چکے تھے۔ اس میں بہت سی غزلیں ان مشاعروں کی ہیں جن پر دلّی کی شاعری کا خاتمہ ہونے والا تھا۔ اور جن میں بارہا سید انور، سید

دیوانِ انور

(از رسالہ معارف بابت اپریل سنہ ۱۹۲۰ء)

غالب ہے نہ شیفتہ نہ نیّر باقی — وحشت ہے نہ سالک ہے نہ انور باقی
حاؔلی اب اسی کو بزمِ یاراں سمجھو — یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

وہ زمانہ جبکہ دلّی نے اپنے آخری وقت میں تھوڑی دیر کے لئے سنبھالا لیا تھا، اگرچہ اس وقت پرانے کمالات کی سوتیں آئندہ کے لئے بالکل بند ہو گئی تھیں مگر اگلے زمانے کے بچے کھچے اہل کمال سے شہر بھرا بھرا معلوم ہوتا تھا۔ باغ میں خزاں کے آثار نمودار ہو گئے تھے لیکن مرغان خوش الحان خزاں کی آمد آمد سے بے خبر بدستور ہر طرف چہکتے نظر آتے تھے۔ دلّی کا یہ اخیر جھمکڑا جس کے تصور سے دل پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے، ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے اور اس کے پس ماندہ قافلہ کو ایک ایک کر کے اپنے سامنے دنیا سے رخصت کیا ہے۔

اب محو بوئے گل یہ ہوا کب دلِ حزیں — ہم کو چمن سے یاد ہے جانا بہار کا

اسی قافلے میں ایک جوان صاحب کمال سید شجاع الدین حسین انورؔ عرف امراؤ مرزا خلف الصدق صلاح الدولہ مرصع رقم خاں سید جلال الدین حیدر رضوی استاد بہادر شاہ بادشاہ تھے جو ۱۸۵۷ء میں جبکہ سپاہ باغی کے ہنگامہ نے دلّی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی بعمر سیزدہ سالگی اپنے والد بزرگوار اور برادر بزرگ سید ظہیر الدین حسین ظہیرؔ کے ہمراہ پانی پت میں آ کر کئی برس تک یہاں مقیم رہے یہ پہلا موقع تھا کہ اس یوسف خانماں آوارہ اور خاک میں ملے ہوئے موتی نے راقم کو اپنا خریدار بنایا۔ بیگانگی ایک ہی نگاہ میں آشنائی کے ساتھ بدل گئی اور آشنائی نے جلد جلد محبت و یکجہتی کی سرحد میں قدم رکھنا شروع

انشائے نور احمد

(منقول از انشائے نور احمد صفحہ ۱)

انشائے نور احمد مولوی نور احمد صاحب سابق ممبر ٹیکسٹ بک کمیٹی پنجاب نے
مڈل اور پرائمر کے طلبہ کو خطوط نویسی سکھانے کے لئے مرتب کی تھی۔ مندرجہ
ذیل ریویو انشائے مذکور پر ۲۰ر نومبر ۱۸۹۹ء کو مولانا نے پانی پت سے لکھ کر
مصنف کو بھیجا تھا۔

اس انشا کو میں نے لیٹے لیٹے دیکھا۔ افسوس کہ میں اُس پر مفصل ریویو کرنے
کے قابل نہیں ہوں، مگر اس قدر بلا تصنع لکھتا ہوں کہ اُردو میں آج تک میں نے کوئی انشا
اس سے بہتر نہیں دیکھی۔ آپ کی کتاب انوار الاخلاق بلاشبہ عمدہ کتاب ہے لیکن اس
انشا سے ہر شخص جو خط و کتابت سیکھنی چاہتا ہے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ علاوہ خط و
کتابت کے عرضی نویسی، وثیقہ نگاری اور ہر قسم کی تحریریں جو کچہریوں اور دفتروں میں لکھی
جاتی ہیں، سب کے لئے یہ کتاب ایک عمدہ رہبر ہے، امید ہے کہ اس کی قبولیت
روز بروز بڑھتی جائے گی اور مبتدیوں کو اس سے بے انتہا فائدہ پہنچے گا۔

یہ تمام مضامین اُن نصائح و اخلاق پر مشتمل ہیں جن کی فی زمانناہندوستانیوں کو عموماً اور
طالب علموں کو خصوصاً نہایت ضرورت ہے۔ مصنف نے ہر ایک مضمون کے متعلق وہ باتیں
لکھی ہیں جو سکول کلاسوں کی استعداد اور سمجھ کے لائق اور اُن کی حالت کے مناسب
ہیں اور مطالب کے ادا کرنے میں ایسا سٹائل اختیار کیا ہے جس کی پیروی اور تتبع کرنے
سے سکول کلاسوں کے طالب علم مایوس نہ ہوں۔ مضمون نگاری میں جبکہ اس سے کسی
خاص درجہ کے طلبہ کو انشا پردازی سکھانی مقصود ہو، سب سے اہم اور ضروری بات
یہی ہے کہ طرزِ بیان ایسی اختیار کی جائے جس کو اس درجہ کے طالب علم بآسانی اختیار
کر سکیں۔

انوارُ الاخلاق

(منقول از انوار الاخلاق پانچواں اڈیشن ۱۸۹۵ء صفحہ ۱۹۱-۲۰۰)

مولوی نور احمد صاحب نورؔ کی مصنفہ اُردو مضامین کی ایک کتاب ہے جو عرصہ تک پنجاب کے مڈل اور ہائی اسکولوں میں بہت مقبول رہی۔

جتنے مضامین اس کتاب میں درج ہیں، میں نے اول سے آخر تک کچھ خود دیکھے اور اکثر پڑھوا کر سُنے۔ مصنف کی طرزِ بیان سے جو ملک کی خیر خواہی اور طالبعلموں کی ہمدردی کا جوش ظاہر ہوتا ہے وہ ہر وطن دوست کو ان مضمونوں کے اول سے آخر تک دیکھنے اور پڑھنے پر مجبور کرتا ہے۔

مصنف کی اصل غرض ان مضامین کے لکھنے اور ترتیب دینے سے جیسا کہ اُن کے عنوانِ بیان سے ظاہر ہے، یہ معلوم ہوتی ہے کہ مڈل اور انٹرنس کے طالب علم جن کو جو آ مضمون میں امتحان دینا پڑتا ہے اُن کے لئے ایک ایسا ذخیرہ معلومات کا مہیا ہو جائے جو ان کو اس سبجکٹ میں مدد دے۔ لیکن ضمناً ان مضامین سے وہ بکار آمد ہدایتیں اور نصیحتیں بھی حاصل ہوتی ہیں جن کی اس زمانہ میں نہایت ضرورت ہے۔

اس کتاب میں ۳۵ مضمون ہیں جن کے عنوان حسب تفصیل ذیل ہیں۔

وقت۔ کفایت شعاری اور فضول خرچی۔ ورزش۔ تعلیم نسواں۔ بچپن کی شادی۔ بچوں کو زیور پہنانا۔ شرافت انسانی۔ اخلاق (یعنی حسن معاشرت) خوشامد۔ اتفاق۔ ہمدردی۔ صحبت یا ہمنشینی۔ ادب۔ محنت۔ ہمت اور استقلال۔ سفر۔ علم۔ مطالعہ۔ اخبار۔ چھاپہ۔ لکھنا۔ پڑھنا۔ حساب۔ صنعت و حرفت۔ زراعت۔ تجارت۔ دیسی اور ولایتی کپڑا۔ ٹیکا اور چیچک۔ روشنی۔ ریل گاڑی۔ تاریخ و جغرافیہ۔ ایک آدھ علمی مضمونوں کے سوا

کے لئے کیوں ایسی شرطیں لگائیں جن سے حدیث کا دائرہ تنگ ہو جائے ؟ روایت کے اصول جو انھوں نے فن حدیث میں قائم کئے اُن سے اسلام کو کیا فائدہ پہنچا ؟ فقہ کی حالت امام صاحب سے پہلے کیا تھی ؟ اور انھوں نے اُس کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ؟ فقہ کی تدوین اور اُس کو ایک جامع قانون کی حد تک پہنچانے کا خیال اُن کو کیونکر پیدا ہوا فقہ کی تدوین انھوں نے کس احتیاط کے ساتھ کی اور کیسے کیسے جلیل القدر لوگوں کو اس میں شریک کیا۔ فقہ حنفی کو اس قدر حسن قبول کیوں حاصل ہوا ؟ کس لئے وہ تمام ممالک اسلامیہ میں پھیل گئی اور با وجودیکہ امام صاحب میں مثل دیگر ائمہ مجتہدین کے ذاتی خصوصیتیں نہ تھیں، کیوں اُن کی فقہ نے اس قدر رواج پایا ؟ - انھوں نے ثابت کیا ہے کہ امام صاحب ہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے تشریعی اور غیر تشریعی حدیثوں میں فرق اور امتیاز قائم کیا، ورنہ اُن سے پہلے شارع کے تمام اقوال و افعال خواہ تبلیغ رسالت کے متعلق ہوں اور خواہ دنیوی مصالح سے سب تشریعی سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے بہت عمدگی سے یورپ کے بعض مورخوں کے اُس شبہ کو کہ فقہ حنفی رومن لا سے ماخوذ ہے دفع کیا ہے اور بتایا ہے کہ مسلمانوں نے غیر قوموں کی قانونی کتابوں سے بہت کم واقفیت حاصل کی ہے اور فقہ حنفی کی تدوین تک کوئی ترجمہ یونانی وغیرہ سے نہیں ہوا، چہ جائیکہ کسی قانونی کتاب کا ترجمہ جو آج تک ثابت نہیں ہے۔ انھوں نے کمال لیاقت سے وہ خصوصیتیں بیان کی ہیں جن کی وجہ سے فقہ حنفی کو تمام فقہوں پر ترجیح حاصل ہے۔ مثلاً یہ کہ امام صاحب بخلاف اشاعرہ کے حسن و قبح اشیاء کو عقلی مانتے ہیں نہ شرعی۔ یا یہ کہ فقہ حنفی بہ نسبت تمام فقہوں کے زیادہ آسان ہے۔ اور شریعت کا اصل مقصد جس کی بابت تصریح کی ہے کہ"

جیسا فقہ حنفی سے حاصل ہوتا ہے اور کسی فقہ سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس بات کو مصنف نے ایسی خوبی و بسط کے ساتھ لکھا ہے کہ اس کو دیکھ کر نہایت تعجب ہوتا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ جس قدر کتابیں امام صاحب کے حالات میں پہلے لکھی جا چکی ہیں، اس بات نے سیرۃ النعمان

نہیں کرتا بلکہ اُس کو اپنے مذاق کے موافق بدلنا چاہتا ہے، اُس کو نہایت سخت عقبات سے
عبور کرنا پڑتا ہے۔ وہ ابواب و فصول بالکل نئے ڈھنگ سے مقرر کرتا ہے اور بے شمار
پراگندہ اور منتشر باتوں کو پہلے اُن ابواب و فصول پر تقسیم کرتا ہے، پھر ہر ایک باب اور ہر
ایک فصل میں ان کو ترتیب وار بیان کرتا ہے، ایک ہی بات کبھی اس کو اول لکھنی مناسب
معلوم ہوتی ہے اور کبھی آخر اور بیچ میں۔ سیرۃ النعمان کے مصنف کو شاید پہلے حصہ کی
ترتیب میں جو امام صاحب کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے، ایک آدھ کتاب سے جو تصنیف
کے وقت اُن کے پاس موجود تھی کچھ مدد ملی ہو تو ملی ہو، لیکن دوسرا حصہ جس میں امام صاحب کے
طرزِ اجتہاد اور اصولِ استنباط سے بحث ہے، اُس کی ترتیب میں یقیناً اُن کو اپنے مذاق اور
سلیقہ سے کام لینا پڑا ہے۔ اور جہاں تک ہم دیکھتے ہیں دونوں حصوں میں حسنِ ترتیب کا
حق پورا پورا ادا ہوا ہے۔ فلسفہ میں حسن کی تعریفیں مختلف طور پر کی گئی ہیں، لیکن سب سے
زیادہ جامع و مانع تعریف یہ ہے کہ حسن تناسبِ اعضا کا نام ہے۔ پس جس طرح کسی حسین آدمی
کی نسبت صرف یہ کہہ دینا کہ اُس کے اعضا متناسب ہیں، اس کے کمالِ حسن و جمال کا اقرار
کر لینا ہے اسی طرح کسی کتاب کی نسبت صرف یہ کہنا کہ اس کی ترتیب ٹھیک ہے گویا یہ مان لینا ہے
کہ اُس میں کوئی عیب نہیں ہے۔ اس کتاب میں جو استدلال نقل و روایت سے کیا گیا ہے
گو وہ مخالف پر حجت نہ ہو سکے لیکن موافقین کی تسلی کے لئے کافی و وافی ہے۔ اور ایک ایسے
سوال پر جس میں ہزار برس سے اختلافات چلے آتے ہیں ایسا استدلال جس کا مدار محض نقل و
درایت پر ہو اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ رہا وہ استدلال جس میں قابلِ ادب مصنف
نے اپنی رائے اور قیاس سے کام لیا ہے، اُس کی نسبت کم سے کم یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں
ہے کہ ایسے طریقہ استدلال سے ہمارے لٹریچر میں فلسفۂ مذہب کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔
مصنف نے نہایت عمدگی سے بتایا ہے کہ کیونکر امام صاحب اور اُن کے اتباع کو اہل الرائے
کہا گیا؟ کس لئے انھوں نے مذہب میں قیاس کو کثرت سے دخل دیا؟ - روایت حدیث

سیرۃ النعمان

(از علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ بابت ۱۸۹۲ء صفحہ ۵۶)

مولانا کی چند بیش بہا تصنیفیں اس سے پہلے چھپ کر شائع ہو چکی ہیں، جیسے "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم"، "مامون رشید کی سوانح عمری"، "رسالہ جزیہ"۔ انھوں نے اپنی ہر ایک پہلی تصنیف میں جس بلندی پر آپ کو دکھایا ہے، اُس کے بعد کی تصنیف میں اُن کی لیاقت اور روشن دماغی اُس سے بلند تر منظر پر جلوہ گر ہوئی ہے۔ اور جہاں تک میری نگاہ پہنچتی ہے میں سیرۃ النعمان کو اُن سب سے اعلیٰ منظر پر پاتا ہوں۔ اگرچہ اس کتاب پر ریویو لکھنا ایک محدث، فقیہ، مورخ اور ماہر فن رجال کا کام ہے اور میں ان چاروں صفتوں سے معرّا ہوں، لیکن ممکن ہے کہ مثلاً ایک شخص جو ریل کی حقیقت سے واقف نہ ہو مگر اُس میں بیٹھ کر سفر کر چکا ہو، وہ لوگوں کے سامنے جو اب تک ریل میں سوار نہیں ہوئے محض آسائش یا تکلیف کی کیفیت جو اُس پر ریل کے سفر میں گذری ہو بیان کرے۔ ریویو لکھنے میں بشرطیکہ وہ دیانت اور سچائی سے لکھا جائے، اکثر اس اصول پر عمل کیا جاتا ہے کہ کتاب کا وہ حصہ جو ریویو نگار کی رائے کے موافق ہوتا ہے، اُس کی داد دیجاتی ہے اور جس قدر اُس کی رائے کے خلاف ہوتا ہے وہ مصنف کی لغزش یا خطا پر محمول کیا جاتا ہے۔ اور اس سے یہ لازم آتا ہے کہ مثلاً جو کتاب تسنن یا تشیع یا تقلید یا عدم تقلید کی تائید میں لکھی جائے، اُس پر مخالف مذہب کا آدمی کبھی عمدہ ریمارک نہ کر سکے۔ یا جو مضمون ایک اسکول کے فلسفہ پر لکھا جائے ہرگز دوسرے سکول کا پیرو اُس کی داد نہ دے سکے۔

میرے نزدیک ریویو نگاری کا منصب صرف اس بات کا دیکھنا ہے کہ مصنف نے وہ فرائض جن کو زمانہ کا مذاق ہر نئی تصنیف میں اس طرح ڈھونڈتا ہے جس طرح پیاسا پانی کو

ہے آٹھ آٹھ دس دس ترجموں کی نوبت پہنچی ہے۔ ترکی زبان میں خاندان سلطنت کے ایک رکن رکین نے قدیم ترجموں کے علاوہ ایک اور ترجمہ گلستاں کا حال ہی میں مرتب کیا ہے۔ پنڈت ہرچند داس صاحب کی کوشش زیادہ تر اس سبب سے قدر کے لائق ہے کہ انھوں نے زبان حال کے مصنفین اور مؤلفین کی طرح اس ترجمہ سے کوئی فائدہ ملحوظ اور مدنظر نہیں رکھا جس طرح قدیم زمانے کے اہل علم اور ارباب تصنیف ابنائے جنس کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے مفید کتابوں کی ترتیب میں اپنی عمریں صرف کرتے تھے، اسی طرح پنڈت صاحب نے اس ترجمہ کے سرانجام کرنے میں محض اس لئے جد و جہد کی ہے کہ جو لوگ فارسی خط اور اردو زبان کی نسبت ناگری خط اور ہندی بھاشا سے زیادہ مانوس ہیں وہ شیخ کے پاکیزہ اور لطیف خیالات سے پورا پورا لطف اٹھائیں۔ لائق مترجم نے اس ترجمہ میں یہ التزام کیا ہے کہ نثر کا ترجمہ نثر میں اور نظم کا نظم میں لکھا جائے۔ اور عربی فارسی الفاظ جہانتک ممکن ہو استعمال میں نہ لائے جائیں اور جہاں تک ہو سکے ترجمہ میں اصل کتاب کے الفاظ کی پابندی کیجائے، اور شیخ کا اسلوب بیان تابمقدور اپنی حالت پر قائم رہے۔ نظم میں ہر بیت کا مضمون ایک ہی دوہرے میں ختم ہو جائے تاکہ ناظرین کو مصنف کا خیال سمجھنے کے لئے دوسرے دوہرہ کا منتظر رہنا نہ پڑے۔ یہ تمام التزام جس قدر ضروری ہیں اس سے زیادہ دشوار ہیں۔ اور جبکہ مترجم کو بھی خیال ہو کہ زبان کی خوبی ہاتھ سے نہ جائے تو یہ دشواری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ہم کو امید ہے کہ پنڈت صاحب کی یہ کوشش ہموطنوں کے حق میں نہایت مفید ثابت ہوگی اور یہ ترجمہ جس کی بنیاد محض نفع رسانی پر رکھی گئی ہے، ضرور مقبول خاص و عام ہوگا۔

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اُردو زبان کی متعدد ڈکشنریاں جو یورپین مصنفوں نے انگریزی زبان میں ترتیب دی ہیں جیسے شیکسپیئر۔ فوربس اور فالن وغیرہ (جن میں سے فالن ڈکشنری تو خاص اسی مؤلف کی مصالح اور سات برس کی معاونت سے تیار ہوئی) ان سے اُردو ڈکشنری کے جامع کو ضرور کسی نہ کسی قدر مدد ملی ہوگی۔ مگر اس سے اُس کی وہ فضیلت جو کسی کام میں تقدم کرنے والے کو حاصل ہوتی ہے، زائل نہیں ہو سکتی۔ اول تو جو دقتیں ایک اورنٹیل اسکولر کو انگریزی کتابوں سے مدد لینے میں برداشت کرنی پڑتی ہیں، وہ اُن مشکلات سے شاید کچھ ہی کم ہوں گی جو کسی زبان کی پہلی ڈکشنری کے جامع کو پیش آتی ہیں۔ دوسرے تمام مذکورہ بالا انگریزی ڈکشنریوں کو اس ڈکشنری کے ساتھ مقابلہ کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مصنف نے اپنی کتاب کی بنیاد صرف انگریزی ڈکشنریوں ہی پر نہیں رکھی بلکہ بہت کچھ زیادت و نقصان و تغیر و تبدل اور دخل و تصرف جیسا کہ اہل زبان کو شایاں ہے اپنے علم و رائے کے موافق کیا ہے اور اسی لئے اُس کی ڈکشنری میں بمقابلہ انگریزی ڈکشنریوں کے وہ تفاوت پایا جاتا ہے جو اہل زبان اور زبان دانوں کی تحقیقات میں ہونا ضروری اور ناگزیر ہے۔

ہم کو امید ہے کہ ہمارے ہموطن اس اُردو ڈکشنری کی ایسی ہی قدر کریں گے جیسی کہ حق شناسوں کو اپنے محسن کے احسان کی قدر کرنی چاہیئے۔

اور سلف ہلپ کے لحاظ سے بالکل ویسا ہی کام کیا ہے جیسا جانسن نے کیا تھا۔

اگرچہ ممکن ہے کہ اُردو ڈکشنری میں کچھ باتیں گرفت کے قابل نکلیں لیکن ایسی باتوں سے اوچھے نکتہ چینوں کی طرح تمام کتاب کو مورد طعن ٹھہرانا یا مصنف کا احسان نہ ماننا سخت بے انصافی ہوگی۔ آدمی بالطبع اپنی بزرگی اور تفوق ثابت کرنے کا شائق ہوتا ہے، اس لئے وہ کسی نہ کسی طرح اپنے دل کو تسکین دے لیتا ہے۔ جو لوگ کچھ کام نہیں کرتے یا نہیں کر سکتے وہ اکثر اوروں کے کام میں عیب نکال کر نہ صرف لوگوں کی نظر میں اپنی فوقیت ظاہر کرتے ہیں بلکہ خود بھی اپنے تئیں اُن سے بہتر سمجھ لیتے ہیں۔ مگر جو لوگ منصف مزاج ہیں اور تحقیق الفاظ کی مشکلات کا اندازہ کر سکتے ہیں وہ امید ہے کہ ہرگز ایسا خیال نہ کریں گے۔ اکثر اوقات صرف ایک لفظ کی تحقیق میں لوگوں سے کئی کئی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں، پس ممکن نہیں کہ جو شخص ایک مستقل اور وسیع زبان کے تمام الفاظ کی تحقیقات کرے وہ لغزش اور خطا سے محفوظ رہ سکے۔ ہر کام جب اول ہی اول کیا جاتا ہے تو اس میں بالضرور بہت سی باتیں فروگذاشت ہو جاتی ہیں۔ پھر وقتاً فوقتاً زمانہ اُن کی اصلاح کرتا ہے۔ مگر پیشوائی کا منصب صرف اُسی کام کے لئے ہے جو سب سے اول کیا گیا ہے۔

جوہری نے صحاح بیس[۲] برس میں مرتب کی تھی اور اُس کے بعد مجدالدین فیروزآبادی نے قاموس صرف تین برس میں لکھ لی۔ ایک منصف عالم کے سامنے صاحبِ قاموس کی کی نہایت تعریف کی گئی کہ اُس نے قاموس جیسی کتاب تین برس میں مرتب کر لی۔ اُس عالم نے کہا، تین برس میں نہیں ۲۳ برس میں لکھی ہے، ۲۰ برس جوہری کے بھی اس پر اضافہ کرنے چاہئیں۔ ہم کو امید ہے کہ ہمارے ہموطن اس ڈکشنری کے بعد اس سے زیادہ جامع اور عمدہ ڈکشنریاں لکھنے کی کوشش کریں گے اور شاید وہ اپنی کوششوں میں کامیاب بھی ہوں، مگر اہل انصاف کے نزدیک تمام آئندہ ڈکشنریاں جو اُردو زبان کی تکمیل کے لئے لکھی جائیں گی وہ سب اس ڈکشنری کی طفیلی ہوں گی۔

تمام دربار پر حاوی رہے۔ اس لئے اعلیٰ طبقہ میں انھیں کی زبان جاری ہوئی۔ لیکن دہلی کے ادنیٰ طبقوں میں سے اگر کچھ لوگ وہاں گئے بھی ہوں تو اُن کی تعداد اس قدر ہرگز نہیں ہوسکتی کہ اُن کی زبان لکھنؤ کے تمام عوام الناس کی زبان پر غالب آجائے۔ اس لئے ضرور ہے کہ لکھنؤ کے ادنیٰ طبقوں کی زبان اُس زبان سے مغایر ہو جو دہلی کے انھیں طبقوں میں متداول تھی۔ پس ہمارے نزدیک صرف دلّی ہی کی زبان ایسی ہے جس پر اُردو ڈکشنری کی بنیاد رکھی جائے۔

دوسری شرط یہ تھی کہ ڈکشنری لکھنے والا شریف مسلمان ہو۔ کیونکہ خود دہلی میں بھی فصیح اُردو صرف مسلمانوں ہی کی زبان سمجھی جاتی ہے۔ ہندوؤں کی سوشیل حالت اُردوے معلیٰ کو اُن کی مادری زبان نہیں ہونے دیتی۔ کمال خوشی کی بات ہے کہ ہماری ملکی زبان کی پہلی ڈکشنری جس پر تمام آئندہ ڈکشنریوں کی نیو رکھی جائے گی ایک ایسے شخص نے لکھی ہے جس میں دونوں ضروری شرطیں موجود ہیں۔

جانسن نے ۱۷۵۵ء میں جب انگریزی زبان کی پہلی ڈکشنری لکھنے کا ارادہ کیا تھا تو اُس نے ایک دولتمند امیر کو اپنی ڈکشنری کا پیٹرن بنانا چاہا تھا تاکہ اُس کی مدد سے اپنی کتاب چھپوا سکے، مگر اُس نے پیٹرن بننا منظور نہیں کیا۔ آخر محض اپنے دست و بازو پر بھروسا کرکے عام قبولیت کی امید پر اُس نے اپنا کام شروع کیا اور نہایت استقلال کے ساتھ اُس کو انتہا تک پہنچایا اور تمام قوم سے اپنی محنت کی داد لی۔ گو اس کے بعد ویبسٹر اور اوگلوی جیسی نہایت عمدہ عمدہ ڈکشنریاں لکھی گئیں جن سے جانسن کی ڈکشنری کو اب کچھ نسبت نہیں رہی لیکن جب تک انگلستان اور انگلستان کی زبان زمین کے پردہ پر موجود ہے ہمیشہ جانسن کا نام سب سے اول نہایت ادب اور تعظیم کے ساتھ لیا جائے گا۔ ہماری یہ آرزو ہے کہ اُردو ڈکشنری بھی ہندوستان میں وہی وقعت حاصل کرے جو اول جانسن کی ڈکشنری نے انگلستان میں حاصل کی تھی۔ کیونکہ اُردو ڈکشنری کے جامع نے بھی ہمت، استقلال، محنت

پر عبور حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ عربی لغات کی کتابیں خرید اکرتا تھا۔ ایک بار اُس نے کئی ہزار
روپئے کی کتابیں اسی غرض سے خریدیں اور جب ان کو اول سے آخر تک دیکھ چکا تو ایک
روز مجلس میں کسی نے شیخ سے ان کتابوں کا حال پوچھا۔ اُس نے کہا الحمدللہ جو حقیر رقم میں
نے ان کتابوں کے خریدنے میں صرف کی تھی اُس سے مجھکو بہت فائدہ ہوا۔ میں نے
دو لغت ان کتابوں میں ایسے پائے جو پہلے میری نظر سے نہ گذرے تھے۔ چونکہ اس ڈکشنری
میں قطعاً اور یقیناً اُردو کے ہزاروں ٹکسالی اور مستند الفاظ ایسے موجود ہیں جو اکثر
ہندوستانیوں کے حق میں بالکل نئے اور اجنبی ہوں گے اس لئے جو قدر فیضی نے ان کتابوں
کی کی تھی، اُس سے بہت زیادہ ہم کو اس ڈکشنری کی قدر کرنی چاہئے۔

ہندوستان میں جب سے کہ اُردو تحریر کا زیادہ رواج ہوا ہے، وقتاً فوقتاً اُردو ڈکشنری
کی ترتیب کے لئے جا بجا تدبیریں ہوتی رہی ہیں۔ ایک زمانہ میں سائنٹفک سوسائٹی علیگڈھ
نے بھی ایک نمونہ اُردو ڈکشنری کا چھاپ کر شائع کیا جو فی الواقع بہت سلیقہ کے ساتھ لکھا
تھا۔ لیکن جس حد تک کہ مصنف نے اس کام کو پہنچایا ہے، آج تک کسی نے نہیں پہنچایا۔

اُردو ڈکشنری لکھنے کے لئے دو نہایت ضروری شرطیں تھیں۔ ایک یہ کہ اُس کا
لکھنے والا کسی ایسے شہر کا باشندہ ہو جہاں کی زبان تمام ہندوستان میں مستند سمجھی جاتی ہو اور
ایسے تمام ہندوستان میں صرف دو شہر مانے گئے ہیں، دلّی اور لکھنؤ۔ مگر میں دلّی کو لکھنؤ پر
ترجیح دیتا ہوں۔ اگرچہ اُردو زبان کا وہ حصہ جس کو زیادہ تر خواص استعمال کرتے ہیں
دہلی و لکھنؤ میں چنداں تفاوت نہیں رکھتا، لیکن عوام کی زبان جس سے اہل حرفہ و اہل بازار
کے محاورات و اصطلاحات مراد ہیں، اور جو زبان کا بہت بڑا حصہ اور آج ڈکشنری کا جزو اعظم
ہے، وہ دہلی میں بہ نسبت لکھنؤ کے زیادہ مستند سمجھے جانے کے لائق ہے۔ شاہانِ اودھ کے
مورث اعلیٰ کے ساتھ جو خاندان دہلی سے بگڑ کر لکھنؤ گئے تھے، وہ اکثر دہلی کے امراد شرفا کے
خاندان تھے جن کے اعقاب و اخلاف آصف الدولہ بلکہ سعادت علی خاں کے زمانہ تک

صفائی اور بے تکلفی سے عروضی مباحث اس میں بیان کئے ہیں اور امید کیجاتی ہے کہ اس
صاف و شفاف نظم کے ذریعہ سے طلبہ کو عروض کی ضروری باتیں آسانی یاد
ہو سکیں گی۔

رسالہ منتہی العروض

(منقول از منتہی العروض صفحہ ۳-۴)

فن شعر کے متعلق یہ کتاب دو چھوٹے چھوٹے رسالوں "منتہی العروض" اور "مثنوی تحفۃ الشعرا" پر مشتمل ہے۔ سید محمود صاحب خلف میر محمد صاحب مرحوم امام جامع مسجد دہلی اس کے مصنف ہیں۔ کتاب ۸۶ صفحہ پر ۱۲۸۳ھ میں شائع ہوئی تھی۔

میں نے یہ مفید رسالہ بقدر ضرورت اور مثنوی تمام و کمال دیکھی اور پڑھی۔ فارسی میں اس فن کی متعدد کتابیں متداول ہیں جن میں سے بعض کو تمام اہل صناعت نے تسلیم کیا ہے۔ مگر بظاہر کوئی اُردو کا جامع رسالہ خصوصاً پنجاب میں آج تک ایسا شائع نہیں ہوا جو عروض کی تمام ضروریات کو حاوی ہو یا ایسے ضبط و انتظام کے ساتھ لکھا گیا ہو جس سے اس فن کے وحشی اور اجنبی مسائل متحضر کرنے میں طالب علم کو مدد ملے۔

جہاں تک رسالہ منتہی العروض کو میں نے دیکھا ہے میرے نزدیک وہ اکثر اعتبارات سے ان دونوں تعریفوں کا مستحق ہے ظاہرا اس رسالہ میں عروض کی کوئی ضروری بات فرو گذاشت نہیں ہوئی اور زحافات کا بیان جو اکثر فارسی رسالوں میں بھی پورا پورا بیان نہیں ہوا، اس رسالہ میں بوجہ استیفا لکھا گیا ہے۔ پھر زحافات کا باب جو اکثر کتابوں میں نہایت منتشر طور پر لکھا گیا ہے، اس رسالہ میں ایسا نہیں ہے بلکہ ایسے ضبط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ طالب علم کو اس کے یاد کرنے میں میرے نزدیک ضرور مدد دے گا۔

مثنوی کی نسبت صرف یہ کہنا کافی ہے کہ نظم میں عروض یا کسی اور فن کا بیان کرنا جس قدر دشوار ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔ باوجود اس کے مصنف نے بہت

کتابوں سے بھی اخذ کی ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ جہاں تک کہ علمی مضامین کے بیان میں آسانی اور سہولت ہو سکتی ہے بہت صاف اور سلیس ہے۔ اگرچہ اس کے مطالب سمجھنے میں مستعد طالب علموں کو بھی کسی نہ کسی قدر تامل اور غور کرنے کی ضرورت ہو گی لیکن علمی مسائل کا بیان اس سے زیادہ سہل اور آسان ہونا نہایت دشوار ہے۔ ہندوستان کے انصاف پسند فاضلوں کا اتفاق ہے کہ جس طرح تمام یورپ میں ہر علم کی اصطلاحیں خاص لاطینی اور یونانی سے لی گئی ہیں اسی طرح ایشیا میں بھی کوئی خاص زبان ایسی ہونی چاہئے جس کی اصطلاحیں مشرق کی تمام علمی کتابوں میں داخل کیجائیں۔ مشرقی زبانوں میں صرف دو زبانیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جن سے یہ غرض پوری ہو سکتی ہے، ایک سنسکرت اور دوسری عربی لیکن سنسکرت کا جاری ہونا عرب، شام، ایران، ترکستان اور افغانستان وغیرہ میں قریب محال کے ہے اور نیز علوم جدیدہ کی نئی اصطلاحیں بالفعل سنسکرت میں موجود نہیں ہیں۔ البتہ عربی زبان ایسی ہے جس کی اصطلاحیں ایشیا کے اکثر حصوں میں جاری ہو سکتی ہیں، اور نیز علوم جدیدہ کی بے شمار اصطلاحیں عربی میں وضع ہو چکی ہیں۔ اسی واسطے مصنف نے اس رسالہ میں عربی اصطلاحیں جو کہ مصر کے عربی ترجموں میں برتی گئی ہیں استعمال کی ہیں اگرچہ وہ سردست کسی قدر اجنبی معلوم ہوں گی لیکن یقین ہے کہ بہت جلد وہ اردو زبان میں گھل مل کر ہمارے ہموطنوں کے کانوں سے مانوس ہو جائیں گی۔

چوکھٹ کو ایک دفعہ روز سلام کر آتے ہیں۔ شاہ صاحب کا تکیہ ہو اور ہر روز سہ پہر کو شریف لا دول
کا جگھٹا ہے۔ اُمرا کی سفلہ مزاجی سے اہل کمال کو مسخرگی اختیار کرنی پڑی ہے، وہ اپنا تمام علم و
فضل اور ذہن وجودت اسی میں صرف کرتے ہیں۔ اسی قسم کے صدہا واقعات ہیں جن کو اس
کتاب میں دیکھ کر بے انتہا عبرت ہوتی ہے اور نیرنگیٔ روزگار کا ایک طرفہ تماشا نظر آتا ہے
اگرچہ مصنف نے اپنی کتاب میں کہیں اس بات کی تصریح نہیں کی کہ اُردو شاعری نے ہماری
معاشرت، ہمارے اخلاق، ہمارے خیالات پر کیا اثر کیا لیکن اُس نے شعرا کا حال ایسا
واشگاف لکھا ہے کہ ہر صاحب رائے اُس کو دیکھ کر اس باب میں اپنی رائے قائم کر سکتا ہے
معلوم ہوتا ہے کہ اُردو شاعری کی رفتار سرے ہی سے ایسی بے اصولی تھی کہ وہ جس قدر
آگے بڑھتی تھی اُسی قدر منزلِ مقصود سے دور ہوتی جاتی تھی۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ
اُردو شاعری کا آغاز اور سلطنت مغلیہ کا زوال ایک ہی وقت سے شروع ہوتا ہے، گویا
اُس کا بیج ایسی زمین میں بویا گیا تھا جس میں زراعت کی قابلیت نہیں رہتی تھی۔ شاعری کی
اصلی ترقی کا مدار ملک کی عام شائستگی اور تعلیم پر ہے۔ کیونکہ شعرا کو جس قدر شائستہ اور نکتہ فہم
مخاطب میسر آتے ہیں اُسی قدر اُن کے خیالات شائستہ اور معقول ہوتے جاتے ہیں۔ اسی
بنا پر زمانہ کو عربی میں "افصح المؤدبین" اور انگریزی میں "گریٹ رفارمر" کہا گیا ہے۔ دوسری
چیز جو شاعری کو شگفتہ اور بارور کرتی ہے وہ قومی سلطنت ہے جس ملک میں یہ دونوں
صورتیں نہیں ہوتیں تو شاعری کی اصلی ترقی ناممکن ہوتی ہے۔ مگر شخصی سلطنت سے بھی اس
کو بہت کچھ مدد پہنچتی ہے۔ شعرا کو ایک خاص جماعت کے مذاق کے موافق جو کہ دربارِ شاہی
کے رکن رکین اور اپنے زمانہ کے علم و فضل و لیاقت میں سب سے ممتاز ہوتے ہیں،
اپنے خیالات کی تہذیب اور اصلاح کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ اکبری دورہ کی شاعری اس
کی مصداق ہے۔ افسوس ہے کہ اردو شاعری نے اُس وقت جنم لیا جبکہ اُس کا کوئی مربی اور
سرپرست نظر نہ آتا تھا۔ وہ دربار جو اردو زبان کا ملجا و ماوی تھا برخاست ہو چکا تھا عام

افواہِ خلائق پر جاری ہوں، کسی طرح اس ترتیب کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ بہادر شاہ اول کے عہد سے لے کر بہادر شاہ ثانی کے اخیر وقت تک کہ سلطنتِ مغلیہ کے عین تنزل کا زمانہ ہے تقریباً ڈیڑھ سو برس ہوتے ہیں، اس عبرت انگیز زمانہ کے ایک خاص عالم کی تصویر جیسی اس تذکرہ میں نظر آتی ہے، صفحاتِ تاریخ اس سے معرّا ہیں۔ ان حالات کو زیادہ تر دہلی سے اور اس سے کسی قدر کم لکھنؤ سے تعلق ہے۔ اکثر مقامات پر ان حالات کو پڑھ کر بے اختیار جی بھر آتا ہے اور زمانۂ گذشتہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اس کتاب کو مورخانہ نگاہ سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح قومی ترقی کا ابتدائی ہنگامہ قابلِ دید ہوتا ہے اسی طرح قومی تنزل کا ابتدائی تماشا دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ عالی خاندان مٹتے ہیں اور پست بلند ہوتے ہیں، امیر زادے منصب اور خدمت سے مایوس ہو کر پیشہ یا مزدوری اختیار کرتے ہیں، بعضوں کا دل دنیا سے سرد ہو جاتا ہے اور وہ لباسِ فقر پہن کر کوئی تکیہ آباد کرتے ہیں۔ جن فلک زدہ خاندانوں کو تلاشِ معاش میں رئیسوں اور دولتمندوں کے دروازے جھانکنے پڑتے ہیں وہ عجب کشمکش میں مبتلا ہیں، ضرورت اور فلاکت یہ کہتی ہے کہ پیٹ کے لئے تمام مکروہات کو گوارا کیجئے مگر خاندانی غیرت جو ابھی طبیعتوں سے بالکل نیست و نابود نہیں ہوئی، ناگوار باتوں پر تحمل نہیں کرنے دیتی۔ اگر کہیں مقسوم سے قدم جم بھی جاتے ہیں تو اس کو قیام نہیں ہوتا، جہاں کوئی بات طبیعت کے خلاف دیکھتے ہیں فوراً بگڑ جاتے ہیں اور پھر ادھر رُخ نہیں کرتے۔ خاندان تباہ ہو چکے ہیں، مگر خاندانی افتخار ایک ایک کے دماغ میں بھرا ہوا ہے۔ شرفا کے قافلے جوق جوق دلّی سے لکھنؤ کو چلے جاتے ہیں۔ جن کے باپ دادا دربارِ شاہی کے رکن رکین تھے اُن کی اولاد بادل شاہ اور شاہ تسلیم کے تکیوں میں دھونی رمائے بیٹھی ہے۔ جو عالیشان محلوں میں رہتے تھے وہ درختوں کے سایہ میں پڑے ایںٹھ رہے ہیں۔ جن لوگوں کا استقلال مہماتِ ملکی میں صرف ہوتا تھا اُن کی نسلوں کا استقلال اب خالی بھبکی وضعداریوں میں صرف ہوتا ہے۔ میر صاحب باانیہمہ تقدس بی نورن کی

شاعری کا ذکر جس کی بنیاد خود مصنف نے انجمن پنجاب میں ڈالی تھی قلم انداز کیا گیا ہے۔ لیکن اس باب میں مصنف کی طرف سے یہ عذر ہو سکتا ہے کہ اس طرز کی شاعری ابھی ایسی حالت میں ہے کہ اس کا عدم اور وجود برابر ہے۔ دوسرے جس چیز کی ہدایت خود مصنف سے ہوئی ہے اس کا جتانا مصنف کے معاصرین کا حق ہے نہ کہ خود مصنف کا۔ اس مضمون کے اخیر میں مصنف نے میر انیس اور مرزا دبیر کو خاتمہ شعرائے اردو لکھا ہے، یہ اس نے ایک نہایت انصاف کی بات لکھی ہے بلکہ میر انیس کا رتبہ ہمارے نزدیک اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ ہماری رائے میں اردو شاعری کا پورا پورا اطلاق اگر ہو سکتا ہے تو میر انیس ہی پر ہو سکتا ہے۔ میر انیس پر نہ صرف اہل لکھنؤ بلکہ ان سے زیادہ اہل دہلی کو فخر کرنا چاہئے، کیونکہ ان کے بزرگ اسی معدن کے جواہر تھے۔ یہ مثل کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویا مرثیہ خواں" شاید اس زمانے میں مشہور ہوئی ہوگی جبکہ مرثیہ گوئی کا آغاز تھا اور غزل اور مثنوی معراج کمال کو پہنچ چکی تھیں۔ جیسے ہماری قوم میں اب سے بیس۲۰ برس پہلے علوم قدیمہ کے سامنے علوم جدیدہ ہیچ در پوچ سمجھے جاتے تھے، لیکن اب روز بروز خیالات دگرگوں ہوتے جاتے ہیں۔ نظم اردو میں نیچرل شاعری کا پتہ اگر ملتا ہے تو میر انیس ہی کے کلام میں ملتا ہے اس کے بعد مصنف نے ولی سے لے کر غالب تک شعرائے اردو کے پانچ طبقے کئے ہیں اور ہر ایک طبقہ کے نامور اور مستند شاعر (جو کہ اس کے نزدیک مستند تھے) انتخاب کرتے ہیں؛ اگرچہ بعض طبقات میں ایک آدھ ایسے شاعر کا حال قلم انداز کیا گیا ہے جو اپنے طبقہ میں مستند سمجھا جاتا تھا جیسے طبقۂ پنجم میں مومن خاں مومن یا میر نظام الدین خاں ممنون؛ لیکن اس کا یہ عذر ہو سکتا ہے کہ مصنف نے کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ کسی دور کا کوئی مستند شاعر فروگذاشت نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس نے ہر دورہ میں سے چند شاعر بطور نمونہ کے انتخاب کر لئے ہیں اور اس سے ان تغیرات کا دکھانا منظور ہے جو ہر ایک دورہ میں زبان اردو پر واقع ہوئے ہیں۔ البتہ اگر مصنف تمام شعرائے اردو کا حال

نے اُن کے کلام اور شاعری پر نکتہ چینی بھی کی ہے اور جا بجا اپنی رائے بھی ظاہر کی ہے،
مگر ادب اور تہذیب کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور نہایت خوبی کے ساتھ اس دشوار
گذار مرحلہ کو طے کیا ہے۔ وہ تاریخ اُردو کے مضمون میں پارسیوں، ہندوؤں اور بودھ مت
والوں کا نام ایسے ادب سے لیتا ہے کہ ہمارے بھائی مسلمان اپنے مسلمان بھائیوں کا نام
بھی ایسے ادب سے نہیں لے سکتے۔ مصنف نے اس تذکرہ کے اول میں دو مضمون بابت
اُردو اور نظم اردو کی تاریخ پر لکھے ہیں۔ پہلا جو زبان اُردو سے متعلق ہے، اُس نے انگریزی
موّرخوں کی کتابوں سے نہایت کوشش کے ساتھ چھان بین کر کے مدد لی ہے اور پچھلا
بڑا حصہ جو کہ اُردو، بھاشا، عربی اور فارسی زبانوں سے متعلق ہے وہ خاص مصنف کی
بے انتہا اور بے بہا کوشش کا نتیجہ ہے۔ یہ تمام مضمون نہایت مفید اور بصیرت افزا اور
زبان کی حقیقت کا آئینہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مصنف سے اس باب میں کوئی ضروری
بات فروگذاشت ہوگئی ہو تو اس پر کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جو شخص سب سے
اول کوئی تاریخی مضمون لکھتا ہے اُس کو ہزاروں پریشان باتیں فراہم کرنی پڑتی ہیں اور
ممکن نہیں کہ کوئی ضروری چیز فروگذاشت نہ ہو جائے۔ لیکن ہم افسوس کے طور پر لکھتے ہیں
کہ اُردو زبان کی ترقی کے بیان میں پرچۂ تہذیب الاخلاق کا کچھ ذکر نہیں کیا گیا۔ اگر انصاف
سے دیکھا جائے تو اس پرچہ نے اُردو زبان کو چند روز میں اس درجہ تک پہنچا دیا ہے جو
کم سے کم پچاس برس کے بعد اس کو حاصل ہوتا۔ اُردو لٹریچر پر اس پرچہ کا بہت بڑا
احسان ہے۔ مذہب، اخلاق، معاشرت اور تمدن پر جو اعلیٰ درجہ کے مضامین اس
پرچہ میں لکھے گئے ہیں انھوں نے ثابت کر دیا ہے کہ اُردو زبان کسی مطلب کے ادا کرنے
سے قاصر نہیں ہے۔ بلند خیالات کو سیدھے سادے لفظوں میں موثر طور پر بیان کرنا اسی
پرچہ نے لوگوں کو سکھایا ہے اور اس فخر کا وہ ہمیشہ مستحق سمجھا جائے گا۔ نظم اُردو کی تاریخ کا
مضمون بھی جسکو پہلے مضمون کا ضمیمہ کہنا چاہئے نہایت عمدہ ہے اسکی نسبت بھی کہا گیا ہے کہ اُس میں نیچرل

نہیں ہو کہ وہ مصنف کی کوشش کا پورا پورا اندازہ کرسکیں۔ وہ اُن دو کپڑوں کو جن میں سے ایک کل کے ذریعہ سے اور دوسرا دست و بازو کی محنت سے تیار ہوا ہو ایک ہی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اُن دو آموں کے پھل ہیں جن میں سے ایک نے گرم سیر ملک اور دوسرے نے سرد سیر ملک میں نشو و نما پائی ہو، ایک ہی مزا ڈھونڈتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ جو شخص ایک ایسی وسیع اور علمی شائستہ اور با قاعدہ زبان سے جیسے کہ انگریزی ہے شاعرانہ خیالات کو لے کر ایک ایسی محدود اور بے قاعدہ اور ناکامل اور غیر علمی زبان میں جیسی کہ اُردو ہے ادا کرتا ہے، اُس کی مشکلات کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو واقعی اُس کا ہمدرد ہے۔

بزیرِ شاخِ گل افعی گزیدہ بلبل را نواگرانِ نخوردہ گزند را چہ خبر

اگرچہ اس عام قاعدے کے موافق کہ "الصفو والکدر توأمان" انسان کا کوئی کام خوبی اور عیب سے مبرا نہیں ہو سکتا خصوصاً تصنیف اور تالیف کا دشوار کام جس کا بے عیب ہونا محال ہے۔ لیکن ایک ایسے ملک میں جہاں ترقی ابتدائی حالت میں ہو، نئے اسلوب کی کتابوں کا کم عیب ہونا بھی بے عیب ہونے کی برابر ہے۔ شاید ایک زمانہ ایسا بھی آئے جس میں زمانۂ حال کی عمدہ تصنیفات پر اسی طرح نکتہ چینی کی جائے جیسے آج کل ارسطو اور بوعلی کی تصنیفات پر کی جاتی ہے۔ مگر اس وقت ایسی کتابوں میں خوردہ گیری کی نظر سے خوض کرنا کیا باعتبار ترقی کی حالت کے اور کیا باعتبار خیالاتِ اہل وطن کے اور کیا باعتبار مصنفوں کی امیدوں کے اور کیا باعتبار خوردہ گیری کی نیت کے ایک ایسا کام ہے جس کا شاید ابھی وقت نہیں آیا۔ پس اب ہماری یہ دعا ہے کہ اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی چھپ کر شائع ہو جائے اور ہمارے لٹریچر کی ترقی کے لئے یہ کتاب ایک مبارک فال ہو۔ آمین۔

کو جاسوس اور سینہ زوری کو شیطان اور لوٹ مار کو اُس کی ذریات قرار دے کر ملک فراغ کا خلل پذیر ہونا اور غرور و خود پسندی و حسد کا دخل پانا اور احتیاج کی گرم بازاری اور قحط و وبا کے صدمے اور ملکِ فراغ کے انتظام میں ایک نئی اصلاح کی ضرورت بیان کی ہے پھر دو تجربہ کاروں یعنی تدبیر اور مشورہ کی صلاح سے اہل عالم کا محنت پسند خرد مند کے پاس جانا اور اُس کے حکم سے بسر کردگی ہمت و تحمل جنگلوں اور پہاڑوں کی راہ لینی اور تحصیل معاش میں سرگرم ہونا اور دنیا میں تمدن کی بنیاد پڑنی بیان کی ہے۔ پھر افراط محنت کے مضر نتیجے ویسی ہی محسوسات کی تمثیلوں میں لکھ کر انجام کو یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دنیا میں جب تک آرام اور محنت دونوں اعتدال کے ساتھ نہیں رہتے تب تک صحت، خوشی اور جرأت حاصل نہیں ہوسکتی۔

اس مضمون کا اسلوبِ بیاں ہماری زبان کے قدیم اسلوبوں سے بہت کم ملتا ہے۔ اس میں معقولات کی تصویریں محسوسات کی شکلوں میں کھینچی ہیں اور انسانی خصلتوں کے نیچرل خواص ایسے موثر اور دلکش پیرایوں میں بیان کئے ہیں جن سے ہمارا لٹریچر بیشک خالی ہے۔ محنت و آرام میں اعتدال اور بے اعتدالی کے اچھے اور برے نتیجے اور آرام کے لئے محنت کی اور محنت کے لئے آرام کی ضرورت جس طرح پر کہ واقع ہیں ہی، اس مضمون کو پڑھ کر اُس کی صورت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اسی اسلوب پر اور تمام مضامین لکھے ہیں جن کے دیکھنے اور غور کرنے سے مغربی شاعرانہ خیالات کی بلندی اور وسعت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا علم انشا آئندہ کہاں تک ترقی کرے گا اور مغربی خیالات کے فوٹو ہماری زبان میں کس درجہ تک خوبی کے ساتھ کھینچے جائیں گے۔ مگر ہمارے ملک کی موجودہ حالت میں نیرنگِ خیال ایک ایسا نمونہ ہے کہ اگر میری رائے غلط نہیں تو زمانۂ آئندہ میں اس کی قدر ہی نہیں بلکہ پیروی بھی کی جائے گی۔ اگرچہ اس وقت اہل وطن کے محدود خیالات اور ادھورے مذاق اور ناتجربہ کار آنکھ سے یہ امید

یہ پہلی ہی کتاب ہے جس نے اس سربستہ قفل کو کھولا ہے اور اہل وطن کے لئے علم انشا کی ترقی کا ایک نیا رستہ نکالا ہے ۔ یہ کتاب دیباچہ کے علاوہ نو اسیز یعنی جواب مضمونوں پر مشتمل ہے جن کے عنوانات حسب تفصیل ذیل ہیں :-

(۱) اُردو اور انگریزی انشا ۔ (۲) آغاز آفرینش میں دنیا کا کیا رنگ تھا اور پھر رفتہ رفتہ کیا ہو گیا ؟ (۳) سچ اور جھوٹ کی لڑائی (۴) امید ۔ (۵) سیر زندگی ۔ (۶) انسان کسی حالت میں خوش نہیں رہتا ۔ (۷) علوم کی بدنصیبی ۔ (۸) علم اور ذکاوت کا مقابلہ ۔ (۹) شہرت اور بقائے دوام ۔ پہلے مضمون میں اول مطلق زبان کی حقیقت بیان کی گئی ہے کہ وہ کیا چیز ہے اور اس کی ماہیت بہت سی تمثیلوں کے پیرایہ میں ظاہر کی ہے ۔ پھر اردو میں جو قصور اور نقصان ہیں وہ بتلائے ہیں اور یہ جتایا ہے کہ زیادہ تر اُس کا قصور اور نقصان اس سبب سے ہے کہ اس کو پیدا ہوئے ڈیڑھ سو برس سے زیادہ نہیں گذرے اور وہ سلطنت انگریزی کے عروج سے پہلے روزمرہ کی گفتگو کے سوا کسی کام میں نہیں آئی ۔ مگر انگریزی حکومت کی ترقی کے ساتھ اُس نے بھی ترقی کرنی شروع کی اور اب جس قدر ہندوستان میں علوم کی ترقی ہوگی اُسی قدر زبان کو ترقی ہوگی ۔ پھر یہ ثابت کیا ہے کہ اصناف نوعِ بشر کے طبعی خیالات سب آپس میں متقارب اور متشابہ ہوتے ہیں اور اس کے ثبوت میں دقت، غصہ، عشق، شہرت اور حسن کی مثالیں دے کر سمجھایا ہے کہ جن پیرایوں میں ان چیزوں کو اہل مغرب نے بیان کیا ہے انھیں کے قریب قریب مشرقی زبانوں میں اہل مشرق نے بیان کیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اگر اُردو زبان کے علم انشا میں انگریزی لٹریچر کی چاشنی دی جائے تو کوئی بعید اور دشوار بات نہیں ہے اور اردو کی اصلی ترقی اسی بات پر موقوف ہے ۔

دوسرے مضمون میں اول ابتدائے آفرینش کی خالص نیچرل حالت کا خاکا کھینچا ہے ۔ دنیا کو ملکِ فراغ اور خسرو آرام کو اُس کا فرمانروا قرار دیا ہے ۔ پھر فریب

اُس کے امن لوگوں نے جن کے دامن انگریزی زبان کی خاردار جھاڑیوں میں نہیں اُلجھے (یعنی
جنھوں نے انگریزی زبان کو انگریزی انشا میں کمال حاصل کرنے کے لئے نہیں سیکھا) یا
جن کے دماغ میں مغربی خیالات کی لپٹ کسی مشرقی زبان کے ذریعہ سے پہنچی ہے، اپنی تصانیف
اور تراجم سے اہل وطن کو اس قدر فائدہ پہنچایا ہے کہ جس قدر روشنی آج عام ہندوستانیوں
میں عام پائی جاتی ہے، وہ اُنھیں کی بدولت پائی جاتی ہے۔

مصنفِ نیرنگِ خیال (دام بقائہم) بھی انھیں واجب التعظیم لوگوں میں سے
ہیں۔ ہم نے ہمیشہ ان کو اسی دھن میں سرگرم پایا ہے کہ جس قدر واقفیت کا سرمایہ فراہم ہو
وہ وقتاً بعد وقتٍ اہل وطن کی ضیافت طبع میں صرف ہوتا رہے۔ جس قدر اُن کے
افادات کتابوں اور رسالوں اور اخباروں کے ذریعہ سے شائع ہو چکے ہیں ہمارے
قیاس میں اُن سے وہ چند اُن کے پاس مرتب اور تیار رہوں گے جو اہل وطن کی بے پروائی
اور ناقدردانی کے سبب سے اب تک شائع نہیں ہوئے۔ مگر جب تک ہمارے
ہموطنوں کے کانوں میں داستان امیر حمزہ اور بوستانِ خیال کی صدائیں بھری ہوئی
ہیں ایسی ناآشنا آوازوں کو کون سنتا ہے ؎

مشامت اختلال آباد بوئے سیر و انگوزہ — شمیم مشک و بوئے عنبر سارا چہ میدانی

یہ کتاب جس وقت ہمارے ہاتھ میں آئی، ایک ہی جلسہ میں دو ثلث سے زیادہ
دیکھی گئی۔ جو ذوق اور خوشی ہم کو اس کے دیکھنے سے ہوئی وہ ہم کو مصنف کی شکر
گذاری پر مجبور کرتی ہے۔ اب تک اکثر علوم کی کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ
ہو چکی ہیں۔ طبیعیات، کیمسٹری، طب، فلسفہ، منطق، ریاضی کی تمام فروعات، ہیئت،
حرکت و سکون وغیرہ وغیرہ بقدر ضرورت ہماری دیسی زبان میں موجود ہیں بہت
ضروری تاریخیں اور کچھ ناول بھی ترجمہ ہوئے ہیں۔ جغرافئے بھی لکھے گئے ہیں مگر مغربی
شاعرانہ خیالات کی جھلک تک آج تک ہندوستانیوں نے نہیں دیکھی تھی۔ نیرنگ خیال

لیکن زیادہ تر اُس کا پھیلاؤ عرض و طول میں ہوا ہے، ارتفاع میں وہ ویسی ہی پست ہی
جیسے ہمارے مکانوں کے تلیچے۔ تاریخ، تذکرہ، قصہ، مثنوی، غزل، قصیدہ اور اور
تمام اقسامِ نظم و نثر کی قدیم روش میں کوئی تغیر اس سے زیادہ نہیں ہوا کہ بعض لوگ
اگلی روش کو ناپسند کرنے لگے ہیں۔ مگر یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ ایک شخص بہلی اور
چھکڑے پر ہنستا ہے مگر کوئی نمونہ ایسا نہیں دکھاتا جس کے آگے بہلی اور چھکڑا عام لوگوں
کی نظر سے خود بخود ساقط ہو جائے۔ سچ یہ ہے کہ ہندوستان کی موجودہ حالت میں ایسا نمو
دکھانا اور اس کو پسند خاص و عام کے لائق بنانا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ بعض لوگوں
کا یہ خیال ہے کہ مصنف نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ کام اعلیٰ درجہ
کے انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں سے سرانجام ہوگا، مگر میری رائے بالکل اس کے برخلاف ہے۔
میرے نزدیک جب تک ہمارے اہلِ وطن مغربی علوم اور مغربی لٹریچر اپنی دیسی زبان
میں نہ سیکھیں گے، کبھی اُن کے خیالات میں شگفتگی اور بالیدگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ فرض
کرو کہ ایک باغ میں تمام دنیا کی نباتات اور گل بوٹے فراہم کئے گئے ہیں اور اس کا
اصلی مقصد علم نباتات کی تحقیقات ہے، لیکن اگر اُس باغ کی ترتیب اور آرائش اور
صفائی بھی ایسے نرالے ڈھنگ کی ہو کہ کبھی ہماری نظر سے نہیں گذری تو ہم کبھی اُس کے اصلی
مقصد تک نہیں پہنچ سکتے بلکہ ہماری سیر اور نظر اُس کی بیرونی نمائش اور عجوبگی میں محدود رہے گی۔
انگریزی زبان جو ہماری زبانوں سے بُون بعید رکھتی ہے اُس کے الجھاؤ ایسے
نہیں ہیں جو طالب علم کو زبان کے پیچ و خم سے آگے بڑھنے دیں۔ وہ لغات اور محاورات
کی تفتیش اور تجسس میں ایسا مستغرق رہتا ہے کہ مغربی خیالات جو انگریزی زبان کی جان
ہیں اُس کی طبیعت پر اپنا رنگ نہیں جما سکتے۔ یہی سبب ہے کہ ہم نے آج تک کسی اپنے
ہم وطن بی۔ اے یا ایم۔ اے کی کوئی تصنیف و تالیف جو اس کی عالی دماغی یا وسعت
خیال پر گواہی دیتی ہو یا ملک کے حق میں کوئی معتد بہ فائدہ رکھتی ہو نہیں دیکھی۔ برخلاف

نیرنگِ خیال

(از علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸۸۰ء صفحہ ۳۶۱)

اس کتاب کے مصنف ان قابلِ ادب شخصوں میں سے ہیں جن کی تصنیفات نے تمام سررشتۂ تعلیم پنجاب کو اپنا احسان مند کیا ہے اور جن کے مضامین اور خیالات سے اہلِ پنجاب نے بہت کچھ فائدہ اٹھایا ہے۔ اگرچہ کسی ملک یا کسی قوم میں اہلِ کمال کا نفسِ وجود ہی اُس ملک یا اُس قوم کا فخر کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں فخر انھیں لوگوں پر کرنا بجا ہے جو اپنے ہنر اور کمال کی روشنی سے اپنے وطن یا قوم کو منور کرنا چاہتے ہیں اور اُن سے بھی زیادہ واجب التعظیم وہ لوگ ہیں جو اپنی بیش بہا کوششوں کا ثمرہ یقیناً اپنی زندگی میں نہیں پا سکتے اور پھر بھی کوشش کئے جاتے ہیں۔ وہ اُس مجلس میں جہاں مرہٹی اور بارہ ماسے کے شوقین جمع ہیں دُھرپت اور خیال الاپتے ہیں، مگر ان کی الاپ اس وقت پیاری معلوم ہوگی جب ایسی ایسی کئی مجلسیں برخواست ہو جائیں گی۔ اگرچہ ہمارے ملک کے تمام علوم و فنون نہایت پستی کی حالت میں ہیں مگر ہمارا علم انشا سب سے زیادہ تاسف کے قابل ہے۔ آج تک ایک ایسی ڈکشنری بھی جو عام ہندوستانیوں کے لئے مفید اور زبان کے ضروری حصہ پر حاوی ہو تیار نہیں ہوئی۔ آج تک ایک ایسی گرامر بھی جس میں نہایت ضروری قواعد منضبط ہوں نہیں لکھی گئی۔ جبکہ یہ ابتدائی مراتب بھی اب تک طے نہیں ہوئے تو اور باتوں کا کیا ذکر ہے۔ نظم میں جو الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں وہ اس قدر محدود ہیں کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اور جو خیالات اُن الفاظ کے ذریعہ سے ادا کئے جاتے ہیں، وہ چند معمولی فرسودہ اور بوسیدہ مضامین کے سوا کچھ نہیں۔ نثر میں جو کچھ ترقی ہوئی ہے وہ انھیں دس بارہ برسوں میں ہوئی ہے

اہتمام سے سائنٹفک سوسائٹی علیگڈھ کا عدیم النظیر اخبار نکلتا ہے۔ اگرچہ اقوام المسالک جو عربی زبان میں ہے وہ آج تک ہماری نظر سے نہیں گذری اور کسی ترجمہ کی نسبت صحیح صحیح رائے اسی وقت دیجا سکتی ہے جبکہ اصل کتاب پیش نظر ہو، مگر جو مراحل دشوار گذار اس واجب التعظیم مترجم کو طے کرنے پڑے ہوں گے اُن کو میرا ہی دل خوب جانتا ہے۔ عربی قدیم کا ترجمہ اردو میں کرنا کچھ مشکل بات نہیں ہے۔ اور اسی طرح انگریزی کا ترجمہ کرنا بھی چنداں دشوار نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ عربی قدیم کی متعدد فرہنگیں اور انگریزی کی بشیار ڈکشنریاں موجود ہیں۔ ہاں مگر زمانۂ حال کی عربی کا ترجمہ کرنا ایک ایسا دشوار کام ہے جس سے عہدہ برا ہونا محال معلوم ہوتا ہے، علی الخصوص جبکہ زمانۂ حال کی عربی میں کوئی ایسی کتاب لکھی جائے جو سرتاپا مغربی خیالات سے بھری ہوئی ہو۔ زمانۂ حال کی عربی میں ہزاروں لغات مولّدہ ایسے شامل ہوگئے ہیں جن کا صحاح و قاموس و صراح میں کہیں پتا نہیں۔ اس کے سوا کئی الفاظ عربی حال میں اس قدر مخلوط ہیں جیسے اردو میں عربی یا فارسی الفاظ ملے ہوئے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ دقت واقع ہوئی ہے کہ ہزاروں الفاظ انگریزی اور فرانسیسی اور لاطینی اور یونانی زبان کے اہل مصر اور اہل روم نے معرّب کر کے اپنی زبان میں داخل کر لئے ہیں۔ ان الفاظ کی صورت اپنی اصلی ہیئت سے اس قدر متجاوز ہوگئی ہے کہ اُن کا سراغ لگانا سخت دشوار ہے۔ نہ عربی لغات میں انکا وجود ہے نہ انگریزی ڈکشنریوں میں ان کا نشان ہے۔ ان تمام وجوہ سے اُس دقت کا اندازہ ہوسکتا ہے جو اقوام المسالک کے ترجمہ میں مترجم صاحب کو پیش آئی ہوگی۔ بااینہمہ عام ترجمہ کمال خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اگرچہ ظاہر ابعض مضامین میں ایک نوع کی پیچیدگی اور فی الجملہ الجھاؤ پایا جاتا ہے، مگر غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ مضامین فی نفسہ دقیق اور پیچیدہ ہیں جن کے پورا پورا ادا کرنے سے ہمارے ملک کی ادھوری زبان قاصر ہے۔ بعض مقام پر جو جناب مولوی سید احمد خاں بہادر نے اپنے قلم سے حواشی تحریر فرمائے ہیں، وہ نہایت گراں قیمت

ادا کرنا چاہیے۔ جس نے ہمارے اور ہمارے تمام بنی نوع کے لئے ایسی شمع ہدایت روشن کی۔ من بعد جناب مستطاب نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب بہادر رئیس لوہارو کا شکر گذار ہونا چاہیے جنھوں نے کلکتہ کے سفر میں یہ گراں مایہ جواہر بہم پہنچا کر مجلس خزینۃ البضاعۃ میں ہدیۃً پیش کیا۔ بعد ازاں اُس ہوا خواہِ ملک اور جاں نثارِ قوم کا شکریہ بھی بقدرِ طاقت ادا کرنا ضرور ہے جس کے احسانات سے ہمارا بال بال جکڑا ہوا ہے یعنی سید القوم اور خادم القوم جناب مولوی سید احمد خان بہادر سکرٹری مجلس خزینۃ البضاعۃ جنھوں نے اس کتاب کو قوم کے حق میں نافع سمجھ کر اپنے اخبار گوہر بار کے ذریعہ سے بار بار اس کی خوبیاں جتائیں اور قوم کے دلوں کو اس کے مطالعہ یا اشاعت کی طرف مائل کیا۔ اور سب سے زیادہ ہمارے شکر کا استحقاق اُس ذات فیض آیات کو ہے جنھوں نے محض رفاہِ قوم کے لئے اپنی جیبِ خاص سے ایک گراں مقدار رقم صرف کر کے اُس کے ترجمہ کرانے اور چھپوانے اور رواج دینے میں کوشش بلیغ مبذول فرمائی اور ایک چراغ سے ہزاروں چراغ روشن کر دئے۔ یعنی جناب خلیفہ سید محمد حسن خاں صاحب وزیر اعظم ریاست پٹیالہ جنھوں نے قوم کی ہمدردی کا بیڑا اٹھا کر بہت کچھ کر دکھایا اور ابھی قوم کو اُن سے بہت کچھ امیدیں باقی ہیں۔

یہاں تک جس قدر میں نے لکھا وہ اصل کتاب اقوام المسالک سے تعلق رکھتا تھا۔ نظم المالک ترجمۂ اقوام المسالک کی نسبت ابھی میں نے کچھ نہیں لکھا۔ یہ ترجمہ جناب خلیفہ صاحب ممدوح کے ارشاد سے جناب مولوی محمد اسمٰعیل صاحب اڈیٹر اخبار سائنٹفک سوسائٹی علیگڈھ نے عربی سے زبان اُردو میں تحریر فرمایا ہے۔ مولوی صاحب ممدوح کی لیاقت اور علم و فضل اور سلیقۂ وقائع نگاری اور متانت اور سنجیدگی کمال شہرت اور بلند آوازگی کے سبب کسی کی تعریف کی محتاج نہیں ہے۔ اس ترجمہ کے حق میں کوئی ستائش کا کلمہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا کہ اس کا لکھنے والا وہ ذی لیاقت شخص ہے جس کے حسن

کی تعلیم اور انواع واقسام فنون میں اُن کا ترقی کرنا، لفظ آزادی کی شرح، یورپ میں موجد اور مخترع لوگوں کے حقوق کا بیان اور ان کے سوا اور بے شمار مضامین نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ جن کو دیکھ کر ہمارے ہموطن اپنے یورپ کے حالات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اور اگر انصاف کو ہاتھ سے نہ دیں تو اس بات کا اقرار کر سکتے ہیں کہ فی الحقیقت ہماری موجودہ حالت اہل یورپ کی حالت کے ساتھ وہ نسبت رکھتی ہے جو ڈھور اور ڈانگروں کو انسان کے ساتھ ہے۔

اس کے بعد پہلا حصہ شروع ہوتا ہے جس کے بیس باب ہیں اور ہر ایک باب میں یورپ کی ایک ایک سلطنت کا حال مندرج ہے۔ ہر سلطنت کی تاریخ اور اس کی وسعت وحدود اور اُس کے اصول وقوانین اور طریقۂ سیاست اور طرز انتظام اور رعایا کی حالت اور ہر ایک کی مالی اور جنگی قوتیں اور محاصل کے ذریعے مثل زراعت اور نباتات اور معدنیات اور حیوانات اور تجارت اور صنائع وغیرہ اور بعض ابواب میں ان کے سوا اور خصوصیاتِ ملک کا نہایت کافی طور پر بیان کیا گیا ہے۔

دوسرا حصہ جغرافیہ ارض اور اقسام کرۂ زمین کے بیان میں ہے۔ اور اخیر میں ایک جدول ہجری اور عیسوی سنوں کی مطابقت دریافت کرنے کے لئے لکھی گئی ہے۔ یہ دونوں حصے بھی عام ہندوستانیوں کے حق میں جنھوں نے انگریزی تعلیم نہیں پائی ایک خزانۂ غیبی کا حکم رکھتے ہیں۔ کیونکہ آج تک کوئی کتاب ہماری دیسی زبانوں میں ایسی نہیں لکھی گئی ہے جس میں یورپ کی تمام سلطنتوں اور اقسام کرۂ زمین کا حال مجملاً یا مفصلاً لکھا گیا ہو۔

اس کتاب کی تعریف میں بالاجمال صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ یہ پہلی کتاب ہے جس نے ہمارے ملک اور ہماری قوم پر شائستگی کا دروازہ کھولا ہے۔ اور اگر ہماری افسردہ طبیعتوں میں کسی قدر قابلیت کا مادہ ابھی تک باقی ہے تو یہی کتاب ہماری شائستگی کی از سر نو بنیاد ڈالنے کے لئے کافی ووافی ہے۔ ہم کو سب سے پہلے مصنفِ عالی مقام کا شکریہ

دونوں میں بڑا نقصان اور خرابی پڑتی ہے" اس مضمون سے ہماری قوم (بشرطیکہ اُس کے ادبار کے دن پورے ہوگئے ہوں) بہت کچھ عبرت حاصل کرسکتی ہے کیونکہ جس تعصب نے اُن کو یہ روزسیاہ دکھایا ہے اور اس پستی اور تنزل کی حالت کو پہنچایا ہے، یہ مضمون اُس کی جڑ کاٹنے والا ہے۔ اس کے بعد خودمختاری اور شخصی حکومت کے بُرے نتیجے اور جمہوری اور محدودالاختیار سلطنتوں کی خرابیاں اس شرح وبسط اور لطف وخوبی اور حجت وبرہان کے ساتھ بیان کی ہیں کہ اب سے پہلے کسی مشرقی زبان کی کتاب میں نہیں لکھی گئیں۔ چونکہ تمام اشیاء کی کماہی حقیقت اُن کی اضداد کے مقابلہ سے معلوم ہوتی ہے۔ اور ہمارے ہموطنوں نے آنکھ کھولکر ایک آزاد گورنمنٹ کے سوا کچھ نہیں دیکھا اور شخصی حکومتوں کے جور نہیں اُٹھائے، اس لئے امید کیجاتی ہے کہ وہ اس مضمون کو دیکھ کر انگریزی گورنمنٹ کی قدر کماحقہ پہچانیں گے اور جو دولت (یعنی آزادی) خداتعالیٰ نے اُن کو بن مانگے دے رکھی ہے، اُس کا شکریہ دل سے اداکریں گے۔ اس کے بعد مسلمانوں کو جو ثروت اور شان وشوکت اور علمی وعملی فوقیت زمانۂ سابق میں تمام دنیا کی قوموں کی شہادتوں سے ثابت کیا ہے۔ گویا غیرت مند مسلمانوں کو اس بات کی غیرت دلائی ہے کہ افسوس وصد ہزار افسوس جس اُولوالعزم قوم نے مشرق سے مغرب تک علم وحکمت کی روشنی پھیلائی اور جنھوں نے حسب شہادت وزیراعظم فرانس اہل یورپ کو جہالت کی تاریکی اور ظلمت سے نکالا اور جن کی بدولت بغداد وبصرہ سے لے کر مصر اور فارس تک اور سمرقند سے لے کر غرناطہ اور قرطبہ تک اکثر بلاد یورپ وایشیا وافریقہ مرکز علوم وفنون قرار پائے اور جن کی استادی اور حق تربیت کو آج تک یورپ کے منصف مزاج مورخ مانتے چلے آتے ہیں، اُن کی اولاد ایسی وحشت اور تاریکی کے گڑھے میں اتر جائے جس میں سے نہ آپ اُبھر سکے نہ کسی کی مدد سے ابھرنے کا ارادہ کرے۔

اس کے بعد اہل یورپ کی تحقیقات اور ایجادات کا بیان اور فرانس میں تعلیم اور تعلم کے طریقے، وہاں کے کتب خانوں کی کثرت اور اُن کے عمدہ انتظام، امیرزادوں

کتاب کی جان ہے اور اس سے جس قدر مصنف کی روشن ضمیری اور بالغ نظری ثابت ہوتی
ہے اُس کا اندازہ کرنا میری طاقت سے باہر ہے۔ ہمارے ہموطنوں کے لئے عموماً اور ہمارے
بھائی مسلمانوں کے لئے خصوصاً اس مقدمہ کا ایک ایک جملہ ناصح مشفق اور ہادی برحق کا کام
دیتا ہے۔ اس میں نہایت خوبی کے ساتھ یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ جب کسی غیر مذہب قوم
میں کوئی اچھی خصلت یا مفید بات پائی جائے اور لسانِ شرعی اُس کی تقبیح سے ساکت ہو
تو ہم کو صرف اس خیال سے کہ ہمارے غیر مذہب والوں میں یہ بات پائی جاتی ہے اُس کے
اخذ کرنے میں ہرگز تامل کرنا نہیں چاہیئے۔ اس بات کی تائید کے لئے بہت سی عقلی اور نقلی
دلیلیں پیش کی ہیں جن کے دیکھنے سے منصف مزاج آدمی کا شک بالکل زائل ہو جاتا ہے۔
اس مقام پر وہ روایت بھی ذکر کی گئی ہے جس سے ثابت ہے کہ غزوۂ احزاب میں جو ہمارے
نبیؐ برحق نے خندق کھودنے کا حکم دیا تھا وہ اہلِ فارس کا اتباع تھا اور اسی موقع کے
مناسب کتاب سنن المہتدین نے ایک نہایت شافی قول نقل کیا ہے اور حاشیہ دُرِّ مختار
میں جو علامہ عصر شیخ محمد بن عابد حنفی نے تصریح فرمائی ہے، وہ بھی نقل کی گئی ہے۔ یعنی
یہ کہ ”جن باتوں میں مخلوقِ خدا کی بہتری اور ترقی ہو اگر اُن کے کرنے میں ہم کسی غیر ملت
قوم کے ساتھ مشابہ ہو جائیں تو کچھ خرابی نہیں ہے“۔ اس کے بعد مصنف عالی مقام نے ایک
نہایت لطیف بات لکھی ہے جس کو یہاں نقل کئے بغیر میں ہرگز نہیں رہ سکتا۔ یعنی یہ کہ ”بڑے
تعجب کی بات ہے کہ جو لوگ فرنگیوں کی باتوں کے اتباع سے سخت انکار کرتے ہیں، وہ اپنی بھلائی
کی باتوں میں تو انکار کرتے ہیں اور جو باتیں اُن کے حق میں مضر ہیں اُن میں اُن کی مشابہت سے
کچھ ان کو انکار نہیں۔ مثلاً وہ لوگ صریح فرنگیوں کا بنا ہوا کپڑا پہن کر خوش ہوتے ہیں اور
انھیں کا بنا ہوا اسباب گھروں میں رکھتے ہیں اور انھیں کے بنائے ہوئے ہتھیار اور
ضرورت کی چیزیں استعمال میں لاتے ہیں، مگر اُن چیزوں کو خود تیار کرکے کام میں لانے
سے بڑا پرہیز کرتے ہیں۔ حالانکہ اس سے پرہیز کرنے میں اُن کے ملکی انتظام اور ملکی ترقی

اقوامُ المسالِک

یہ یورپ کی ایک مختصر تاریخ ہے جو دربار ٹیونس کے وزیر خیرالدین نے عربی میں لکھی تھی اور مولوی محمد اسمٰعیل نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا تھا مگر آج کل یہ ترجمہ نایاب ہے۔

(از علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸۷۵ء صفحہ ۶۳۵)

عرب سرائے کی علمی سوسائٹی نے مجھکو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ میں اس مفید کتاب کو اوّل سے آخر تک دیکھ کر اُس کی نسبت اپنی ناچیز رائے ظاہر کروں اور یہ بھی لکھوں کہ اس کتاب کا ترجمہ کرانا اور اس کو چھپوا کر شائع کرنا ہندوستان کے حق میں کس قسم اور کس درجہ کے فائدے رکھتا ہے۔ اور اس پر کیا کیا نتائج مترتب ہونے کی امید ہے۔ اقوام المسالک کا مصنفِ عالی مقام ایک روشن ضمیر اور مدبر عالم سید خیرالدین احمد وزیر سلطنتِ ٹیونس ہے۔ جو علم و فضل اور عقل و دانش اور حدسِ صائب اور رائے سلیم کے سوا قومی ہمدردی کے نشے میں چُور معلوم ہوتا ہے اور جس نے بنی نوعِ بشر کی خیرخواہی میں اپنی گراں بہا عمر کا ایک بڑا حصہ نہایت مفید طور پر صرف کیا ہے۔

ٹیونس افریقہ میں ملک بربر کے چار مختلف صوبوں میں سے ایک صوبہ ہے جس کا دارالسلطنت خاص شہر ٹیونس ہے۔ اس شہر میں تقریباً ایک لاکھ آدمی رہتے ہیں جس میں چالیس ہزار یہودی اور باقی مسلمان عرب وغیرہ آباد ہیں۔ یہ صوبہ ممالک بربر میں بہت بڑی تجارت گاہ ہے۔ یہاں کے باشندے عموماً صاحب لیاقت اور شائستہ ہوتے ہیں۔ اور یہاں کا بادشاہ اپنے ملک میں اقتدار مطلق رکھتا ہے۔

یہ کتاب ایک نہایت طولانی مقدمہ اور دو حصوں پر مشتمل ہے۔ یہ طولانی مقدمہ ساری

تاریخ کی مالک وہ قوم ہے جس کے آگے بغیر حجت و دلیل کے کسی کی تعریف یا تنقیص پیش نہیں چل سکتی۔
جس شخص کے لئے اُنھوں نے پچاس عیب ثابت کئے ہیں ہم اُس کی کیسی ہی طرفداری کریں
مگر اُس کے دس پندرہ عیب بے شک ماننے پڑیں گے، ورنہ ہم کو راستی سے ضرور ہاتھ
اٹھانا پڑے گا۔

واقفیت کا ذریعہ کسی ایسی کتاب کو ٹھہرائیں جس کا مصنف تعصب سے بالکل مبرّا ہو۔ پس ہم اپنے
ہموطنوں کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اُن کے ایک ہمدرد اور خیر خواہ وطن نے اُن کے ملک کی قدیم
اور جدید اور درمیانی زمانوں کے تاریخی حالات نہایت راستی اور درستی کے ساتھ تحریر کرکے
اُن کے لئے ایک ایسا سرمایہ مہیّا کیا ہے جس کے وہ سخت ہی حاجتمند تھے۔ خاتم آلِ تیمور کی
کی نسبت جو مصنف نے اپنی عادت کے موافق آزادانہ گفتگو کی ہے اور مناقبت کے ساتھ
کسی قدر معائب بھی بیان کئے ہیں، اس میں شک نہیں کہ اُس نے واقع میں اپنا فرض ادا
کیا ہے۔ مگر مجھکو امید نہیں کہ ہمارے دیرینہ سال یا دیرینہ خیال ہموطن ایسی آزادانہ
تحریر کو پسند کریں۔ ہمارے ملک پر ابھی آزادی کا پرچھاواں نہیں پڑا۔ ہم لوگ ہرگز
نہیں چاہتے کہ جس شخص کو ہم میں سے سو پچاس آدمی کسی نیک صفت کے ساتھ متصف جانتے
ہوں، اُس کی کوئی برائی واقعی یا غیر واقعی ہمارے سامنے بیان کیجائے۔ مثلاً جو شاعر
ہمارے نزدیک مسلم الثبوت ہے ضرور ہے کہ ہم اُس کے تمام کلام کو الہامی کلام
کی طرح تمام عیوب سے پاک سمجھیں۔ اور مثلاً جس بادشاہ میں ایک رحم دلی کی صفت
ہے، ضرور ہے کہ ہم اُس کو بلاتشبیہ انبیاء کی طرح معصوم جانیں۔ لیکن ہم مصنف کی
طرف سے ایک جواب دیتے ہیں جس کو شاید پرانی طبیعت کے لوگ بھی رد نہ کریں گے۔
ناظرین کا فرض ہے کہ اگر سب نہیں تو صرف سلاطین مغلیہ کا حال بابر سے لے کر بہادر شاہ
تک اول انگریزی تاریخوں میں دیکھیں، پھر اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیں اور پھر انصاف
کریں کہ اُن کے معزز ہموطن نے اپنے ملک کے اگلے بادشاہوں کو اہل یورپ کے
مطاعن سے کس قدر بچایا ہے۔ اور جس قدر اُن کی برائیاں اُس نے تسلیم کی ہیں اُن کا
تسلیم نہ کرنا اپنے تئیں مورخینِ صداقت آئین کے زمرے سے خارج کر دینا تھا یا نہیں۔ ہم کو
یاد رکھنا چاہئے کہ ہندوستان کی تاریخ اب ہندوستانیوں کے ہاتھ میں نہیں ہے کہ
جس کو وہ چاہیں آسمان پر چڑھائیں اور جس کو چاہیں تحت الثریٰ تک پہنچا دیں۔ اب اس

کی بھٹائی، شہزادوں کی ولادت، شادیوں کی دھوم دھام، نجومیوں کا نیک ساعت بتانا، یا زائچہ اور پترا بنانا، جوگیوں کے ڈھکوسلے، نقیبوں کی لن ترانیاں، چھوٹے چھوٹے زمینداروں کی سرکشی، سینکڑوں قصے اور افسانے خلاف قیاس وغیرہ۔ ان سب باتوں سے یہ کتاب بالکل پاک وصاف ہے۔ اور وہ بے بہا اور گراں قدر نتائج جو عام تاریخ کی جان ہیں اور جن سے ایشیائی تاریخیں قطعاً بے نصیب تھیں، اُن کے لحاظ سے مشرقی تاریخوں میں یہ پہلی ہی کتاب ہے جس میں یورپ کے روشن ضمیر مورخوں کا پورا پورا تتبع کیا گیا ہے۔ ہر ایک سلطنت کا اثر جو ملک پر یا ملک کا اثر جو سلطنت پر ہوا، اُس کا بیان، ہر ایک سلطنت کے زوال یا ترقی کے اسباب، ہر ایک بادشاہ کی خصلتیں اور اُس کا چلن و رویہ، ہر موقع پر بہ حسب ضرورت رائے لگانی اور اس میں تعصب اور طرفداری کو دخل نہ دینا، اس کتاب کی اُن خصوصیات میں سے ہے جن کی چھینٹ تک ہمارے ملک کی تاریخی کتابوں پر نہیں پڑی۔ تاریخی واقعات کو مصنف مدظلہ نے جس دلچسپ پیرایہ میں ادا کیا ہے اور پھر باوجود اس کے کہیں افراط و تفریط کو دخل نہیں دیا، یہ بات اگر محال نہیں تو تعجب انگیز ضرور ہے۔ ایک روشن ضمیر عالی دماغ آدمی نے اس کتاب کی نسبت یہ رائے دی ہے کہ اس میں ہر جگہ دو چار صفحوں کے بعد دس پانچ سطریں ایسی دلچسپ اور دلکش آتی ہیں جن کو پڑھ کر با مذاق آدمی سر دھننے لگتا ہے۔ میں نے بھی اس کتاب کو جس قدر پڑھا اُس میں بے شک یہ صفت پائی۔ بعض جگہ بے اختیار میرا جی بھر آیا اور بعض جگہ میرے دل میں جوش محبت پیدا ہوا، بعض جگہ اُس کے خلاف اثر ظاہر ہوا، بعضے مقام پر میری کسی قدیم رائے میں تذبذب واقع ہو گیا، اور بعضے موقع پر میری کسی رائے کو تقویت حاصل ہوئی۔ یہ باتیں اس امر کی دلیل ہیں کہ مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ تہ دل سے لکھا ہے کسی کی تقلید یا مخالفت سے اپنے دلی خیالات کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ کیونکہ جو بات اوپر کے جی سے لکھی جاتی ہے وہ ایسی دلنشیں اور دل آویز ہرگز نہیں ہو سکتی۔ جن بادشاہوں کو

ہماری ایک ایسی شدید ضرورت رفع ہوئی ہے جس کا رفع کرنا مصنف جیسے روشن ضمیر اور جوانمرد آدمی کے سوا اوروں سے سخت دشوار تھا۔ اگرچہ فارسی زبان میں بعض تاریخیں مثل تاریخ فرشتہ اور سیر المتاخرین وغیرہ کے ایسی بھی لکھی گئی ہیں جو بہ نسبت اور کتابوں کے کسی قدر جامعیت رکھتی ہیں، مگر اس زمانہ کا ایک شائستہ محقق اُن کے مطالعہ سے ہرگز اپنی پیاس نہیں بجھا سکتا۔ ہندوؤں کے قدیم زمانہ کے واقعات حال ہی میں یورپ کے ایسیلے مورخوں نے ایسے ذریعوں سے دریافت کئے ہیں جو قدر و قیمت میں ایشیا کے کشف و کرامات سے زیادہ گراں بہا ہیں۔ مثلاً آثار قدیمہ، پُرانے کتبے، پُرانے سکے، حملہ آوروں کی تحقیقات، ہندوؤں کی مذہبی کتابیں، علم تطابق السنہ، مختلف قوموں کے خط و خال کی مطابقت وغیرہ۔ جو مراتب ان گراں وزن وسائل سے منکشف ہوئے ہیں اور جن کی بدولت ہندوؤں کی قدیم زمانہ کی تاریکی بہت کچھ رفع ہوئی ہے، اُن سے فارسی تاریخیں بالکل معرّا تھیں اور اس کے سوا عہد انگلشیہ کی تاریخ آجتک کسی دیسی زبان میں نہیں لکھی گئی۔ پس یہ کتاب ان دونوں فائدوں کے لحاظ سے ہمارے ملک کی تاریخوں میں عدیم النظیر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی سلطنتوں کا حال جو اس مفید کتاب میں لکھا گیا ہے اُس کا عام ماخذ فارسی اور عربی کی بے شمار تاریخیں ہیں جو مختلف آدمیوں نے مختلف سلطنتوں کے حال میں قلمبند کی ہیں، لیکن قطع نظر اس کے کہ مصنف نے اُن سب کی تلخیص کر کے اپنے ہموطنوں کو سینکڑوں کتابوں کے مطالعہ سے مستغنی کر دیا، بڑی فوقیت اس کتاب میں یہ ہے کہ ہزاروں نکمی اور فضول باتیں جو مورخ کے ذہن کو جلا کرنے کی جگہ اور زنگ آلودہ کرتی تھیں اور عام تاریخ سے اصلا لگاؤ نہ رکھتی تھیں، جیسے اہلکاروں کا تقرر و تبدل، اُن کی ترقی، اُن کا تنزل، بادشاہوں کے حضور میں اہل دربار کی طرف سے پیشکش گذرنے، اہل دربار کو بادشاہوں کی طرف سے خلعت اور انعام یا القاب و خطاب ملنا، جشنوں کی تیاریاں، سیر و شکار کے سامان، شاعروں کی مدح سرائی، بھانڈ

تاریخ ہندوستان

(از علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸۷۵ء صفحہ ۳۸۲)

خان بہادر شمس العلما مولانا ذکاء اللہ مرحوم نے منجملہ سینکڑوں کتابوں کے ایک ہندوستان کی نہایت مفصل تاریخ بھی لکھی ہے جو ۱۶ ضخیم جلدوں اور تین علٰحدہ علٰحدہ حصوں پر منقسم ہے۔ مولانا کا یہ ریویو تاریخ مذکور کے حصۂ دوم متعلق بہ عہد مسلمانان پر ہے۔

عنوان پر جو نام کتاب کے ساتھ اُس کے نامی گرامی مصنف دام بقائہٗ کا نام نامی ثبت کیا گیا ہے، اس سے ناظرین بالتمکین سمجھ گئے ہوں گے کہ کتاب کی عظمت و جلالت کس درجہ کی ہوگی، اور ملک میں اُس کی مقبولیت کس حد تک پہنچنے والی ہے۔ کیونکہ مصنف ممدوح اور اس کی بیشمار کتابوں نے جو شہرت اور نیکنامی تمام اقطاع ہندوستان میں حاصل کی ہے اُس سے یہ بات خوب ثابت ہوگئی ہے کہ اس واجب التعظیم آدمی کی تصنیفات آج کل ملک کے حق میں اکسیر اعظم کا حکم رکھتی ہے۔ یہ کتاب اصل میں تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں ہندوؤں کے قدیم زمانہ کا حال ہے۔ اور یہ حصہ منطبع ہو کر ۱۸۷۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔ دوسرے حصے میں مسلمانوں کی سلطنت کا حال ہے۔ یہ ابھی چھپ کر تیار ہوا ہے اور ہمارا ریویو زیادہ تر اسی حصے سے تعلق رکھتا ہے۔ تیسرے حصے میں سلطنت انگلشیہ کا بیان ہے، یہ حصہ ابھی اختتام کو نہیں پہنچا مگر امید ہے کہ شروع ۱۸۷۶ء میں چھپ کر شائع ہو جائیگا۔ اس کتاب سے پہلے کوئی تاریخ کسی مشرقی زبان میں ایسی نہیں لکھی گئی جو ہندوستان کی تمام سلطنتوں پر حاوی ہو، بلکہ الفنسٹن کے سوا کوئی ایسا ترجمہ بھی دیسی زبان میں نہیں ہوا۔ پس اس ضروری تصنیف سے ہمارے ملک کی کتابوں کی صرف مقدار ہی نہیں بڑھی بلکہ

۱۲۔ تقریر بموقعہ عطائے خطاب حکیم اجمل خاں

(از علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۵ جنوری ۱۹۰۸ء)

۱۹۰۸ء کے شروع میں جب حکیم محمد اجمل خاں صاحب (مرحوم) کو گورنمنٹ نے "حاذق الملک" کا خطاب مرحمت فرمایا تو حکیم صاحب کو مبارکباد دینے اور گورنمنٹ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے، جنوری ۱۹۰۸ء کو باشندگان دہلی کا ایک عظیم الشان جلسہ کمپنی باغ کے ٹاؤن ہال میں نواب امیرالدین احمد خاں صاحب والیِ ریاست لوہارو کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ مولانا اُس وقت اتفاقاً دہلی میں تشریف رکھتے تھے۔ چنانچہ آپ نے بھی جلسہ میں شرکت فرمائی۔ مولانا نے یہ تقریر اُسی جلسے میں فرمائی تھی۔

صاحبو! آج ہم ایک ایسی خوشی کے اظہار کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں جس میں امید ہے کہ ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگ دل سے شریک ہوں گے۔ جس میں بناوٹ اور ظاہرداری کا کچھ لگاؤ نہیں معلوم ہوتا اور جو بعینہٖ ایسی ہی خوشی ہے جیسی مسلمانوں کو عید بقرعید میں، ہندوؤں کو ہولی دیوالی میں اور بڑے دن کی تعطیل میں ہر ایک قوم کو اپنی اپنی کانفرنس یا کانگریس کی خوشی ہوتی ہے۔

جو معزز خطاب گورنمنٹ ہند نے جناب رئیس الاطبا حکیم محمد اجمل خاں صاحب کو حال میں عطا کیا ہے وہ نہ صرف اہل دہلی و نواح دہلی کے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے ہر حصہ اور صوبہ کے لوگوں کو خوشی کا باعث ہوا ہے۔ حکیم صاحب جس نامور اور شہرۂ آفاق خاندان کے ممبر ہیں اُس کی ناموری اور شہرت ہندوستان کی حدود سے گذر کر ایشیا کے اکثر حصوں تک پہنچ گئی ہے۔ اس خاندان نے صرف علم طب، حذاقت اور دست شفا

آتی۔ چونکہ قومی مشکلات کا حل ہونا قوم کی متفقہ ہمدردی و دلسوزی پر موقوف ہے اس لئے جب تک بہت سے قوم کے ہمدرد پیدا نہ ہوں گے۔ اس مقصد میں کامیابی ناممکن ہے۔

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد   اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

صاحبو! سب سے بڑی کامیابی اس سال کی کانفرنس میں یہ ہوئی ہے کہ جس قدر رزولیشن پاس ہوئے ہیں اُن میں سے اکثر عملی اور نتیجہ خیز ہیں اور گورنمنٹ کی توجہ اور قومی لیڈروں کی کوشش سے امید ہے کہ اُن پر بہت جلد عملدرآمد ہوگا۔ اب میں اس تقریر کو ختم کرتا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ کراچی کا اجلاس قوم کے حق میں اور خاص کر اہل سندھ کے حق میں مثمر برکات و منتج حسنات ہو۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

کے مضمون پر غور کرنا، امید ہے کہ میرے ہم قوموں اور ہم وطنوں کے حق میں مفید ہوگا:-

میتواں در فضل و دانش شہرۂ دوراں شدن
در فصاحت ہمچو سحباں در خرد لقماں شدن

میتواں در جاہ و ثروت گوئی از قاروں بُرد
میتواں در زہد و طاعت غیرتِ صنعاں شدن

میتواں در ملک و دولت خسرو پرویز گشت
میتواں در زور و طاقت رستمِ دستاں شدن

میتواں قطبِ زماں شد میتواں شد غوثِ وقت
ہر چہ خواہی میتوانی شد بجز انساں شدن

چیست انسانی طپیدن از تپِ ہمسائگاں
از سمومِ نجد در باغِ عدن پژماں شدن

خوار دیدن خویش را از خواریٔ ابنائے جنس
در شبستاں تنگدل از محنتِ زنداں شدن

آتشِ قحطے کہ در کنعاں بسوزد باغ و کشت
بر فرازِ تختِ مصر از تابِ آں بریاں شدن

زیستن در فکرِ قوم و مُردن اندر فکرِ قوم
گر توانی میتوانی سید احمد خاں شدن

میتواں مقبولِ عالم گشت امّا ہمچو شیخ
بہرِ سودِ خلق مرد و در جہاں نتواں شدن

جورِ اخواں دیدن و در عشقِ اخواں زیستن
زخمِ پیکاں خوردن و مشتاقِ پیکاں زیستن

کر کے دکھا دے جیسے کہ اس شخص کے ہاتھ سے سرانجام ہوئے ہیں۔"

احمدز کی آفندی نے جو ۱۸۹۲ء میں یورپ کا سفر کیا ہے اس کے ذکر میں یورپ کے اکثر محبان وطن مثل گیری بالڈی، نیلسن گیمبٹا اور ملکہ کیتھرائن وغیرہ کا حال اور اُن کے اخلاقی عیوب بیان کر کے لکھا ہے کہ "اہل یورپ اپنے اپنے ملک کے محبانِ وطن اور خادمانِ قوم کے شخصی اور خانگی کاموں کو خواہ وہ اچھے ہوں یا برے کبھی نہیں دیکھتے اور کبھی بھول کر بھی اُن کی بُرائیوں کا ذکر زبان پر نہیں لاتے بلکہ ہمیشہ اُن کے عام اور مفید کاموں کو دیکھتے ہیں جو انھوں نے اپنی کوشش سے اپنے ملک کو پہنچائے ہیں، طرح طرح سے ان کا نام زندہ کرتے ہیں اور اُن کا ذکر خیر اعلیٰ علیین تک پہنچاتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس نے اٹلی، فرانس اور انگلستان کو آسمان تک پہنچا دیا ہے اور اُن کے رُعب و داب کے آگے دنیا بھر کا سر جھکا دیا ہے۔"

مگر افسوس ہے کہ ہماری قوم میں ایک محب وطن اور خادم قوم کی یہ قدر کی جاتی ہے کہ جب اس میں بظاہر کوئی اخلاقی عیب یا کمزوری نظر نہیں آتی تو اُس کی نیت اور اس کے دل کو ٹٹولتے ہیں اور وہاں پہنچ کر ڈنک مارتے ہیں اور گویا یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہمارے پاس وحی آئی ہے کہ یہ شخص بظاہر جتنے کام قوم کی بھلائی کے کرتا ہے اُن سے اُس کی غرض اپنی ناموری اور شہرت بڑھانے اور گورنمنٹ میں اپنا اعزاز زیادہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دنیا میں ذلیل و خوار ہیں اور ہم میں ایسے لوگ پیدا ہونے موقوف ہو گئے ہیں جو اپنی کوشش سے ملک اور قوم کو فائدہ پہنچائیں۔ برخلاف اس کے ہم ہندوستان کی دیگر ہمسر قوموں میں برابر دیکھتے ہیں کہ ان میں ایسے جوانمرد اور محب وطن بکثرت پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں کیونکہ اُن کی قوم اُن کی عزت کرتی ہے اور اُن کے قدموں کے تلے آنکھیں بچھاتی ہے، اور ہرگز اپنے صوبے کے گورنر کی بھی ایسی تعظیم و تکریم نہیں کرتی جیسی اپنے ملک اور قوم کے ایک ادنیٰ خادم کی عزت کرتی ہے۔

اب میں اس بیان کو ختم کرتا ہوں اور خاتمے پر ایک بند سرسید کے مرثیہ کا پڑھتا ہوں جس

وہ غالباً اس امر میں مجھ سے اتفاق کرے گا کہ وہ اپنی تعلیم و تربیت کی علامتیں ایسی ہی صاف صاف ظاہر کرتے ہیں جیسی کہ انگلستان میں ہمارے پبلک اسکولوں اور یونیورسٹیوں کے گریجوئٹس ظاہر کرتے ہیں۔ علیگڈھ کالج کا طالب علم فیاضانہ خیالات اور ترقی یافتہ تعلیم و تربیت اور آزادانہ خصلت رکھنے والا شخص خیال کیا جاتا ہے۔"

سرسید نے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے صرف محمڈن کالج ہی کے قائم کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" اسی غرض سے ۱۸۸۶ء میں قائم کی جس نے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کا غل ڈال دیا۔ انھوں نے ایک دوسری ایسوسی ایشن "محمڈن سول سروس فنڈ" کے نام سے اس لئے قائم کی کہ قومی چندے سے مسلمان طالبعلموں کو سول سروس کے امتحان میں شریک ہونے کے لئے انگلستان بھیجا جائے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ گورنمنٹ کا ارادہ ہائی ایجوکیشن کو گھٹا کر مشرقی تعلیم کو ترقی دینے کا ہے اور لارڈ رپن کی ایک اسپیچ سے جو لاہور میں اہل پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں انھوں نے دی تھی، اُن کو یقین ہو گیا کہ اگر پنجاب یونیورسٹی کالج کو یونیورسٹی کے اختیارات مل گئے تو پنجاب میں اعلیٰ تعلیم کا نام و نشان باقی نہ رہے گا تو انھوں نے نہایت جوش و خروش کے ساتھ پے در پے تین آرٹکل پنجاب یونیورسٹی کے خلاف لکھ کر شائع کئے جن کا تمام پنجاب میں غل پڑ گیا اور اہل پنجاب میں سے جو لوگ انگریزی تعلیم کی جگہ مشرقی تعلیم پر پنجاب یونیورسٹی کی بنیاد رکھنی چاہتے تھے اُن کے خیالات بالکل بدل گئے۔ پھر جب ۱۸۸۷ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی اسی اصول پر قائم ہونے لگی جس پر پنجاب یونیورسٹی کے قائم ہونے کا گمان تھا اور سرسید کو معلوم ہوا کہ سر ولیم میور سابق لفٹنٹ گورنر جو مشرقی علوم کے بڑے قدردان تھے اُن کی پرانی تجویز کے موافق یہ یونیورسٹی بھی اسی غرض سے قائم ہونے والی ہے کہ مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کو ترقی دی جائے، تو انھوں نے الٰہ آباد یونیورسٹی کی بھی اسی شد و مد کے ساتھ مخالفت کی جیسی کہ پنجاب یونیورسٹی کی کی تھی۔ جو زبردست آرٹکل انھوں نے الٰہ آباد یونیورسٹی پر لکھا تھا اُس میں انھوں نے صاف صاف لفظوں میں تحریر کیا کہ "اگر بالفرض یہ یونیورسٹی

ممکن معلوم ہوتا تھا اب وہی قوم اُس کو یونیورسٹی بنانے کی تدبیریں کر رہی ہے جس مدرسے میں کوئی دہلی یا علیگڈھ کا مسلمان بھی اپنے لڑکے کو بھیجنا نہیں چاہتا تھا آج اُسی میں پنجاب، ممالکِ متحدہ، بنگال مدراس، برہما، آسام، گجرات، بلوچستان، افغانستان اور ایران تک کے سات سو مسلمان بورڈر تعلیم و تربیت پاتے ہیں۔

علیگڈھ محمڈن کالج سے جس قدر مسلمانوں نے اب تک تعلیم میں ترقی کی ہے اُس کو اعداد کے ذریعے سے ہم اس وقت ٹھیک ٹھیک بیان نہیں کر سکتے۔ ہم کو اس امر کی نسبت صرف اس قدر معلوم ہے کہ جب سے کلکتہ بمبئی اور مدراس یونیورسٹیاں قائم ہوئی تھیں اُس وقت سے لے کر ۱۸۸۱ء تک یعنی اُس وقت تک کہ علیگڈھ کالج کے طالب علم یونیورسٹی کے اعلیٰ امتحانوں میں شریک ہونے لگے تمام ہندوستان میں مسلمان گریجوٹس کی تعداد صرف ۳۴ تک پہنچی تھی مگر ۱۸۸۲ء سے ۱۸۹۳ء تک یعنی صرف ۱۲ سال میں تمام ہندوستان کے گریجوٹس کی تعداد ۳۴ سے بڑھ کر ۳۹۹ تک پہنچ گئی۔

سرکاری ملازمت میں جو پست حالت مسلمانوں کی تھی اُس کا کسی قدر اندازہ پایونیر مورخہ ۱۸۷۰ء کے اس فقرہ سے ہو سکتا ہے جو اُس نے صوبۂ بنگال کی نسبت لکھا تھا کہ "تمام بنگال میں چند مسلمان عہدیدار ہیں جو جلد پنشن لینے والے ہیں اور اُن کی جگہ پر یقینی کوئی مسلمان نہیں ہونے کا اور آئندہ بجز چپراسی اور دفتری کے کوئی مسلمان معزز عہدے پر نظر نہ آئے گا۔" اگرچہ پایونیر نے یہ فقرہ بنگال کی نسبت لکھا تھا لیکن اگر سر سید کی چیخ پکار سے شمالی ہندوستان میں تعلیم کا چرچا نہ پھیل جاتا تو یہی حال پنجاب اور اضلاعِ شمال و مغرب میں مسلمانوں کی سرکاری ملازمت کا ہونے والا تھا۔ لیکن جب سے علیگڈھ کالج کے اعلیٰ امتحانوں کے نتیجے نکلنے لگے ہیں اُس وقت سے مسلمان ملازموں کی تعداد معزز عہدوں پر روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور مسلمان بیرسٹروں اور وکیلوں کا شمار بھی روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ اس کالج کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نسبت سر آکلینڈ کالون نے جبکہ وہ اضلاع شمال و مغرب کے لفٹنٹ گورنر تھے، کہا تھا کہ "جو شخص اُن نوجوانوں سے واقف ہے جو اس کالج سے پاس ہو کر نکلتے ہیں

پینے سے منع کرتے تھے، آیتوں اور حدیثوں اور فقہ کی کتابوں سے مدلل کر کے لکھا تھا۔ اس رسالے کا جو اثر ہندوستان میں ہوا اُس کے بیان کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں ہے کیونکہ انگریزوں کے ساتھ کھانا پینا اب ہندوستان میں ایسا عام ہوگیا ہے کہ جن لوگوں کی انگریزوں تک رسائی ہے اور جو اُن سے ملتے جلتے ہیں وہ عموماً اُن کے ساتھ کھانے پینے سے اجتناب نہیں کرتے۔

غرض کہ ۱۸۵۵ء سے لے کر ۱۸۶۸ء تک وہ برابر اُن تدبیروں میں سرگرم رہے جن سے ملک اور قوم کی بھلائی متصور تھی۔ مگر وہ خوب جانتے تھے کہ جب تک مسلمانوں میں مغربی تعلیم نہ پھیلے گی اُس وقت تک اُن کا پنپنا اور ہندوستان میں عزت سے رہنا ممکن نہیں۔ اس منصوبے کے پورا کرنے کے لئے انھوں نے نہایت ضروری سمجھا کہ چند روز انگلستان میں جا کر قیام کریں اور وہاں کے طریقۂ تعلیم و تربیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور پھر ہندوستان پہنچ کر جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کی تعلیم کی بنیاد ڈالیں۔ اس کے سوا انھیں دنوں میں سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر اضلاعِ شمال و مغرب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا حال چار جلدوں میں شائع کیا تھا جس میں اسلام اور بانیٔ اسلام پر دل کھول کر نکتہ چینی کی گئی تھی جس وقت سے وہ کتاب شائع ہوئی تھی سر سید کو اُس کی تردید لکھنے کے خیال نے بے چین کر رکھا تھا۔ مگر اُس کی تردید لکھنے کے لئے جن کتابوں اور نوشتوں کی ضرورت تھی وہ ہندوستان میں نایاب تھے اور صرف "برٹش میوزیم" یا "انڈیا آفس" کے کتب خانوں میں مل سکتے تھے۔

لیکن سر سید احمد خاں جیسے بے سرمایہ آدمی کا ولایت جانا اور وہاں جا کر ایک جنٹلمین کی حیثیت سے قیام کرنا بظاہر ناممکن معلوم ہوتا تھا مگر وہ جو مشہور ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہوتا ہے حسن اتفاق سے انھیں دنوں میں گورنمنٹ ہند نے ہندوستانیوں کو تعلیم کی غرض سے ولایت بھیجنے کے لئے علاوہ تین تین ہزار روپیہ خرچۂ آمد و رفت کے چھ چھ ہزار سالانہ کے نو وظیفے چند صوبوں کے واسطے منظور کر لئے اور صوبۂ اضلاع شمال و مغرب کا وظیفہ سید محمود مرحوم کو مل گیا۔ اگرچہ یہ روپیہ صرف سید محمود کے بھیجنے کے لئے بھی کافی نہ تھا مگر گورنمنٹ کی اس

عیسائیوں سے عداوت ہے، کوئی یہ کہتا تھا کہ شاہ نعمت اللہ ولی کی پیشین گوئی سے تمام مسلمانوں کو یقین
تھا کہ اب عیسائیوں کی عملداری نہیں رہنے کی اور سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ مسلمانوں کے مذہب
کی رو سے انگریزوں پر جہاد کرنا واجب تھا اور اسی لئے سب سے زیادہ بغاوت کے مرتکب ہوئے
سر سید نے ان خیالات کی تردید کے لئے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا جس کا نام "لائل محمڈنز آف انڈیا"
تھا اور جس میں اس بات کی شہادتیں پیش کیجاتی تھیں کہ جس قدر گورنمنٹ کی خیر خواہی میں جانبازی اور
جاں نثاری کے کام غدر کے موقع پر مسلمانوں سے ظہور میں آئے وہ تمام ملک میں کسی قوم سے ظاہر
نہیں ہوئے۔

اس کے بعد اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جو بدگمانیاں مذہب اسلام کی نسبت قدم سے یورپ
میں چلی آتی ہیں اور جن کی وجہ سے ہندوستان کی حکمران قوم یہاں کے مسلمانوں کو گورنمنٹ کے
حق میں نہایت خوفناک جماعت سمجھتی ہے اُن کے رفع کرنے اور اسلام کی اصل حقیقت ظاہر کرنے
کے لئے بائبل کی تفسیر لکھی جائے۔ اور جہاں تک اسلام کے اصول اہل کتاب کے اصول سے
مطابق ہوں اُن میں تطبیق کی جائے اور جہاں جہاں اختلاف پایا جائے وہاں اختلاف کے وجوہات
بیان کئے جائیں اور اس طرح جو بدگمانیاں عیسائیوں کو اسلام کی نسبت ہیں وہ رفع کی جائیں
نیز مسلمان جو موجودہ بائبل کو بالکل محرف سمجھتے ہیں اور اسلام اور عیسائیت کے درمیان ایک
وسیع سمندر کو حائل جانتے ہیں اُن کی اس غلطی کو بھی دور کیا جائے اور اس طرح دونوں قوموں میں
اتحاد پیدا کیا جائے۔ چنانچہ غازی پور میں انھوں نے بائبل کی تفسیر بہت بڑے پیمانے پر لکھنی شروع
کی اور اپنا ہزارہا روپیہ اس کام میں صرف کیا، عربی اور عبرانی کے جاننے والے عالم نوکر رکھے
اور کئی ہزار روپیہ کا پریس تفسیر چھاپنے کے لئے خریدا، اور سرکاری کام سے جو وقت بچا وہ سب
اُس کے ترتیب دینے میں صرف کیا اور بڑی بڑی جلدیں بڑے اہتمام کے ساتھ چھپوا کر شائع کیں
لیکن اس وجہ سے کہ یہ ایک بہت بڑا کام تھا جس کا سرانجام کرنا سر سید کی طاقت اور مقدور سے
باہر تھا اور نیز مسلمان پبلک نے اُس کی قدر نہیں کی آخر کار سر سید کو اس کام سے دست بردار ہونا پڑا۔

جو انھوں نے ملک اور قوم کی بھلائی کے لئے اختیار کیں۔ انھوں نے سب سے زیادہ ضروری اِس بات کو سمجھا کہ گورنمنٹ نے بغاوت کے اسباب سمجھنے میں جو غلطی کی ہے اس کو نہایت دلیری سے گورنمنٹ پر ظاہر کر دیں۔ مگر یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ وہ وقت نہایت نازک تھا خصوصًا مسلمانوں کو بغاوت کے الزام سے بری کرنا سب سے زیادہ مشکل کام تھا۔ گورنمنٹ کو غصہ خاص کر مسلمانوں کے حال پر سب سے زیادہ تھا۔ یہاں تک کہ اُس وقت مسلمان ہونا ہی ایک بڑا سخت جُرم سمجھا جاتا تھا۔ خیالات ظاہر کرنے کی آزادی بالکل نہ تھی۔ مارشل لا کا دور دورہ تھا اور حاکموں کی زبان ہی قانون تھی۔ جو شخص گورنمنٹ کا خیر خواہ اور وفادار تسلیم کر لیا گیا ہو اُس کو ایسی قوم کی حمایت کرنی جس کو گورنمنٹ اپنا بدخواہ سمجھتی ہو اور بھی زیادہ دشوار تھا۔

الغرض انھوں نے خدا پر بھروسہ کر کے مراد آباد میں اسبابِ بغاوتِ ہند پر ایک رسالہ لکھا جس میں رعایائے ہندوستان کو اور خاص کر مسلمانوں کو بغاوت کے الزام سے بری کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ انھوں نے ایسے نازک وقت میں وہ تمام الزامات جو لوگوں کے نزدیک خود گورنمنٹ پر عائد ہوتے تھے نہایت دلیری اور آزادی کے ساتھ بیان کئے اور جو اسباب کہ عمومًا انگریزوں کے ذہن میں تہہ نشین تھے اُن کی تردید کی اور اُن کو غلط بتایا۔

جب یہ رسالہ چھپ کر اُن کے پاس پہنچا اور اُن کے بعض دوستوں کو معلوم ہوا کہ وہ اس کو پارلیمنٹ اور گورنمنٹ انڈیا میں بھیجنا چاہتے ہیں تو انھوں نے نہایت اصرار کے ساتھ سر سید سے کہا کہ خدا کے واسطے ان کتابوں کو جلا دو۔ مگر جب انھوں نے نہ مانا تو رائے شنکر داس جو مراد آباد میں منصف اور سر سید کے نہایت دوست تھے آبدیدہ ہو کر خاموش ہو رہے۔

گورنمنٹ انڈیا میں جب یہ کتاب پہنچی اور انگریزی میں ترجمہ ہو کر کونسل میں پیش ہوتی تو کونسل کے ایک معزز ممبر مسٹر سسل بیڈن فارن سکرٹری گورنمنٹ ہند نے اُس کی نسبت یہ رائے ظاہر کی کہ اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے اس سے حسب ضابطہ بازپرس ہونی چاہئے اور اگر کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دینی چاہئے۔ مگر چونکہ اور کوئی ممبر اُن کا

انجام ہوسکتا ہے۔ سرکاری ملازمتیں نہایت محدود ہیں اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ پس ممکن نہیں کہ ہر تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان کے لئے حسب دلخواہ سرکاری ملازمت مل سکے۔ البتہ صنعت و حرفت کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ جس قدر تعلیم یافتہ لوگ بڑھتے جائیں گے اُسی قدر اُن کی مانگ زیادہ ہوتی جائے گی۔

یورپ کے ایک روشن خیال مصنف کا قول ہے کہ جس ملک یا قوم کا دار و مدار ملازمت پر ہوتا ہے وہ کبھی مرفہ الحال نہیں ہوسکتی۔ اُن کی قدرتی قوتیں ہمیشہ پژمردہ رہتی ہیں اور رفتہ رفتہ بالکل فنا ہوجاتی ہیں۔ لیکن جہاں صنعتوں اور حرفتوں کا دروازہ کھل جاتا ہے وہاں یہ سمجھنا چاہئے کہ قومی زندگی کی بنیاد پڑ گئی ہے اور وہ زمانہ قریب ہے کہ تازگی اور رونق تمام ملک پر چھا جائے گی۔ وہ کہتا ہے کہ یورپ کے جن شہروں میں لوگ ملازمت کرنے کے عادی ہیں وہاں تمام کوچوں اور بازاروں پر ہر وقت افسردگی اور اداسی برستی ہے۔ لیکن جہاں صنعت و حرفت کا بازار گرم ہے وہاں پر ہر شخص کے چہرے پر شگفتگی اور زندہ دلی کے آثار نمایاں نظر آتے ہیں۔

صاجو! صنعت و حرفت کی ضرورت ہندوستان میں عام طور پر تسلیم کیجاتی ہے جب سے سودیشی تحریک شروع ہوئی ہے ہمارے معزز ہموطن اُس کی طرف بھی جلد جلد قدم بڑھا رہے ہیں۔ گورنمنٹ نے بھی تسلیم کر لیا ہے کہ اُس ملک کی مالی مشکلات جس میں وہ اکثر مبتلا ہوتا رہتا ہے، اُن سے نجات پانا محض صنعت و حرفت کی ترقی پر منحصر ہے۔ ممالک متحدہ میں اسی مقصد کے لئے انڈسٹریل کانفرنس قائم کی گئی ہے۔ اور صوبوں میں بھی اس طرف توجہ ہوتی جاتی ہے۔ اگرچہ مسلمان بھی اس کی ضرورت سے انکار نہیں کرتے لیکن عملی طور پر وہ ابتک اُس سے بالکل الگ رہے ہیں اور نہایت اندیشہ ہے کہ جس طرح وہ ابتدا میں انگریزی تعلیم سے نفرت کرنے کے سبب اپنی تمام ہموطن قوموں سے پیچھے رہ گئے ہیں اور اب کسی طرح اُن کی برابری نہیں کر سکتے اسی طرح صنعت و حرفت سے بھی اس وقت تک

۱۰۔ سر سیّد مرحوم

(سر سید کی وفات کے بعد کئی سال تک حیدرآباد دکن میں ہر سال سر سید کی برسی کا جلسہ ہوتا رہا، جس میں مرحوم کی زندگی اور اُن کے کارناموں پر تقریریں ہوتیں اور مضمون پڑھے جاتے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں حسنِ اتفاق سے مولانا حالی مرحوم حیدرآباد میں تشریف فرما تھے۔ برسی کے موقع پر اُن سے ایک مضمون پڑھنے کی درخواست کی گئی جسے انھوں نے بطیبِ خاطر قبول فرمایا۔ یہ وہی مضمون ہے اور اُس وقت رسالہ زمانہ (کانپور) میں شائع ہوا تھا۔)

جس رسم کے ادا کرنے کے لئے آج سب لوگ یہاں جمع ہوئے ہیں یہ اُس شخص کی برسی کی تقریب ہے جس نے پچاس برس متصل ملک اور قوم کی خیرخواہی اور اسلام کی خدمت گزاری میں بسر کئے اور باوجود سخت مخالفتوں کے جو مسلمانوں کی طرف سے اخیر دم تک اس کو پیش آتی رہیں وہ اپنے ارادوں میں نہایت استقلال کے ساتھ ثابت قدم رہا۔ خود مسلمانوں نے جن کی خیرخواہی میں اس نے اپنی دو تہائی زندگی صرف کی، اُس کو کافر، ملحد، نیچری، دجّال سب کچھ کہا۔ اُس کے کفر پر سیکڑوں فتوے لکھائے گئے۔ اُس پر اور اُس کے کاموں پر طرح طرح کی تہمتیں لگائی گئیں۔ اُس کو قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ اس کے برخلاف ملک کے ہر گوشے سے نئے نئے اخبار اور رسالے برابر جاری ہوتے رہے مگر اُس نے کبھی ہمت نہ ہاری اور جو منصوبہ مسلمانوں کی بھلائی اور خیراندیشی کا ابتدا سے باندھا تھا اس کو دمِ واپسیں تک پورا کرتا رہا۔ میری مراد اُس شخص سے سر سید احمد خاں مرحوم ہیں جن کی وفات کو آج پورے آٹھ برس گزرے ہیں۔

کیا خدا کی قدرت ہے کہ جس شخص کو چند روز پہلے کافر و ملحد کہا جاتا تھا اب ملک کے

عملی طور پر اپنے بھائیوں کو دکھائیں کہ زمانۂ حال میں زراعت نے کس قدر ترقی کی ہے
کہ جس زمین سے قدیم طریقہ کے موافق مثلاً پانچ روپیہ بیگہ منافع ہو سکتا تھا اب نئے طریقہ
سے کم و بیش دس روپیہ منافع بہ آسانی ہو سکتا ہے۔

بہرحال مسلمانوں کی ترقی کے لئے محض یونیورسٹی کی موجودہ تعلیم کافی نہیں ہے
بلکہ ضرور ہے کہ وہ تعلیم کے ہر شعبہ میں دستگاہ حاصل کریں اور اُس دوڑ میں جس میں اُن
کے ہموطن اُن سے بہت دور آگے نکل گئے ہیں جہاں تک ممکن ہو شریک ہوں۔ ورنہ
وہ زمانہ قریب ہے کہ اُن کو نہ صرف اپنی عزت اور توقیر سے بلکہ اپنی بقا اور اپنی ہستی سے
بھی ہمیشہ کے لئے دست بردار ہونا پڑے گا۔

جو اپنے ضعف کا کچھ کرتیں نہیں تدارک	قومیں وہ چند روزہ دنیا میں میہماں ہیں
گھڑیال اور مگرمچھ ہیں ان کو نگلے جاتے	دریا میں مچھلیاں جو کمزور ناتواں ہیں
سنبھلو! وگرنہ رہنا یہاں اس طرح پڑیگا	بھیل اور گونڈ جیسے گمنام و بےنشاں ہیں

محتاج اور غریب مسلمانوں کی امداد کرنے میں سب سے زیادہ کوشش کی ہے - اس فیاض شخص نے داغستان میں ایک سو مسجدیں اور ایک سو ابتدائی مدرسے قائم کئے - باکو کے نواح میں عام زراعت کے جدید اصولوں کے مطابق ایک وسیع خطۂ زمین بطور نمونے کے مخصوص کیا تاکہ جدید طریقۂ کاشتکاری کو مسلمان سیکھیں اور اس کی تقلید کریں- روسی زبان اور ترکی زبان میں کئی اخبار شائع کرائے جن سے مقصد یہ تھا کہ مسلمانانِ روس کے حقوق کی حفاظت کیجائے اور مسلمانوں کے ملکی اور سیاسی خیالات کا اُن کے ذریعے اظہار کیا جائے - اس کے سوا انھوں نے لاکھوں روپیہ یورپ اور روس کی یونیورسٹیوں میں مسلمان طلبہ کو تعلیم دلانے میں صرف کیا - روس میں جو آج کل نامور مسلمان ڈاکٹر، وکیل اور انجنیر ہیں وہ سب اس فیاض دولتمند مسلمان کے شرمندۂ احسان ہیں انھوں نے مسلمان لڑکیوں کو بھی فراموش نہیں کیا - چنانچہ باکو میں مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے لئے جس عالیشان مدرسہ کی بنیاد انھوں نے ڈالی ہے صرف اس کی تعمیر پر تین لاکھ یا بیس ہزار پونڈ کی رقم صرف ہوئی ہے - اسی مدرسہ کے اخراجات کے لئے انھوں نے ایک جائداد وقف کی ہے جس کی سالانہ آمدنی تیس ہزار پونڈ یا ساڑھے چار لاکھ روپیہ ہے"

اس کے بعد انھوں نے مسلمانانِ مصر کو مخاطب کرکے کہا کہ "اے معزز و محترم مسلمانانِ مصر! آپ لوگ ہمارے ساتھ اس دعا میں شریک ہوں کہ خداوند عالم اس فیاض ہمدرد قوم کو مدت دراز تک زندہ و سلامت رکھے" پھر کہا "ایسے مسلمان دولتمند جنھوں نے ایک یا دو ابتدائی یا متوسط درجہ کے مدرسے روس میں قائم کئے اُن کی تعداد تو اس قدر زیادہ ہے کہ میں اُن کا کوئی شمار نہیں بتا سکتا - اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ ہم روس کے مسلمانوں نے ترقی کے میدان میں جو قدم بڑھایا ہے وہ انھیں مدرسوں کی بدولت ہے"

صاحبو! اس فاضل لیکچرار کے بیان میں یہ بات غور کے قابل ہے کہ اُس نے

کرنے لگے ہیں اور جدید طرز کے مدارس کھولتے جاتے ہیں اور انھوں نے علوم جدیدہ اور علوم عربیہ وادبیہ کی تحصیل کے لئے اپنے طلبہ کو روس کے مدارس عالیہ اور یورپ، ٹرکی اور مصر کے مدارس میں بھیجنا شروع کر دیا ہے۔ ابتدائی اسلامی مدارس جن کے طریقۂ تعلیم کی اصلاح ہوگئی ہے تعداد میں ایک ہزار کے قریب ہیں۔ مذہبی مدارس میں سے جن کی اصلاح ہو چکی ہے، ایک مدرسہ کازان میں، ایک اورن برگ میں اور ایک اوفا میں ہے۔ ان مدرسوں میں ریاضیات، طبیعیات، جغرافیہ اور تاریخ کی تعلیم دیجاتی ہے اور علوم عربیہ اور علوم دینیہ کی کتابیں بھی حسب معمول پڑھائی جاتی ہیں۔"

اس کے بعد انھوں نے بیان کیا کہ "حسن اتفاق سے روسی مسلمانوں میں ایسے فیاض دولتمند پیدا ہوگئے جنھوں نے اپنی دولت، علم کی اشاعت اور قوم کی اصلاح و ترقی میں بے دریغ صرف کی۔ اُن میں سے خاص کر ذکر کرنے کے لائق مرحوم حاجی نعمت اللہ قرانشف ہیں جنھوں نے ایک سو مدرسوں اور ایک سو مسجدوں کی اپنے روپئے سے بنیاد ڈالی اور ایک عالیشان کتب خانہ قائم کیا جس میں نہایت عمدہ اور نادر کتابیں جمع کی گئی ہیں۔ کازان کے نامور مسلمان تاجر مرحوم احمد حسینی نے بھی مدرسوں کی بنیاد ڈالنے اور علوم جدیدہ کے پھیلانے میں تین لاکھ روبل (یعنی سات لاکھ ساڑھے بارہ ہزار روپیہ) صرف کیا۔ مرحوم احمد حسینی کے بھائی عبدالغنی حسینی نے بھی دو سو ابتدائی اسکول نئے طریقۂ تعلیم کے قائم کئے اور اسکولوں کی اصلاح کے خیالات کو انھوں نے روس کے اندرونی صوبوں ہی میں نہیں بلکہ اُن دور دراز صوبوں میں بھی پھیلایا ہے جو چین کی آسمانی سلطنت کی حدود پر واقع ہیں۔"

اس کے بعد انھوں نے کہا کہ "منجملہ ان فیاض دولتمند مسلمانوں کے ایک حاجی زین العابدین تاقیف ہیں جو باکو کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے علم کو پھیلانے اور

زمینداری سے بھی آخر کار اُن کو دست بردار ہونا پڑے گا جس طرح بدنِ انسان میں خون کی کمی تمام بیماریوں کی جڑ ہے اسی طرح تعلیم کی کمی تمام قومی مصائب کی جڑ ہے۔ بغیر تعلیم کے اب دنیا میں عزت سے رہنا ناممکن ہوگیا ہے۔ اس وقت دور دور سے مسلمان اسی غرض سے کراچی میں آئے ہوئے ہیں کہ سندھ کے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف متوجہ کریں۔ ہز ہائنس میر صاحب خیرپور اور اُن کے روشن ضمیر وزیر نے ان کو اسی لئے مدعو کیا ہے کہ اس ملک کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت پر غور کریں اور ایسی تجویزیں پیش کریں جن سے اُن کی تعلیم میں آسانیاں پیدا ہوں، سرکاری افسر تہ دل سے ترقی تعلیم مسلمانان سندھ کی حمایت کرنے پر آمادہ ہیں۔ مسٹر جائلز ڈائرکٹر جنرل تعلیمات ہند جو پہلے ایک مدت تک اس صوبہ میں ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم رہ چکے ہیں وہ بھی عنقریب تشریف لانے والے ہیں اور امید ہے کہ اپنی تشریف آوری سے اس کانفرنس کو عزت بخشیں گے۔ اب وقت ہے کہ سندھ کے مسلمان خواب غفلت سے بیدار ہوں اور اُن کی ترغیب کے جو اسباب اس وقت جمع ہوگئے ہیں اُن کو غنیمت سمجھیں اور اُن سے فائدہ اٹھائیں۔

زمانہ دیر سے چلا رہا ہے اے مسلمانو!
کہ ہے گردش میں میری غیب کی آواز پہچانو
وہ ناصح اور ہوں گے جن کا کہنا ٹل بھی جاتا ہے
اگر میری نہ مانو گے۔ تو پچتاؤ گے نادانو!
میری بازی کا منصوبہ گیا کب کا پلٹ یارو!
خبر تم کو بھی ہے کچھ اے میری چالوں سے بیگانو!
گئے وہ دن کہ ثروت باپ دادا چھوڑ جاتے تھے
بس اب ثروت ہے مزدوروں کا حصہ اے تن آسانو!
گئے وہ دن کہ لاکھوں بے ہنر یہاں عیش کرتے تھے

اپنے طول طویل لیکچر میں جس کے چند فقرے یہاں نقل کئے گئے ہیں کہیں ایسا اشارہ نہیں کیا
جس سے پایا جائے کہ روس کے مسلمانوں کے ان پرائیویٹ اسکولوں میں گورنمنٹ روس
نے بھی کچھ امداد دی ہے یا نہیں۔ بلکہ برخلاف اس کے صاف صاف اس بات کا اظہار
کیا ہے کہ روس کے مسلمانوں نے جو کچھ تعلیم میں اب تک ترقی کی ہے وہ محض اپنی قوم کی
امداد سے کی ہے۔ ظاہر ہے کہ برٹش گورنمنٹ کی رعایا کا حال اس باب میں گورنمنٹ روس
کی رعایا سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں گورنمنٹ ان قوموں کو جو تعلیم میں اپنے دیگر ہموطنوں
سے نہایت پست حالت میں ہیں طرح طرح سے تعلیم کی طرف متوجہ کرتی ہے اور جہاں تک ممکن
ہے اُن کی تعلیم میں آسانیاں پیدا کرتی ہے اور اُن کے پرائیویٹ اسکولوں میں امداد
دیتی ہے اور اگر اُن کی کوشش سے کوئی بڑا قومی انسٹی ٹیوشن قائم ہوتا ہے تو اُس کی خود
سرپرست بنتی ہے۔ پس ہم مسلمانوں کو بمقابلہ روس کے مسلمانوں کے تعلیم میں ترقی کرنا
نہایت آسان ہے بشرطیکہ ہم اپنی تعلیم کا دارومدار محض گورنمنٹ کی امداد پر نہ رکھیں، بلکہ
گورنمنٹ کو رفتہ رفتہ اپنی تعلیم کے بوجھ سے سبکدوش کرتے جائیں۔ گورنمنٹ کا کام صرف
اس قدر ہے کہ رعایا میں تعلیم کا مذاق اور اُس کی ضرورت کا احساس پیدا کرے۔ اس
کے بعد یہ کام خود رعایا کا ہے کہ وہ آگے قدم بڑھائے اور جو پود گورنمنٹ نے اپنے
پُرزور ہاتھ سے لگا دی ہے اُس کو اپنی ذاتی کوشش اور محنت سے پروان چڑھائے
اور ملک اور قوم کو اُس سے فائدہ پہنچائے۔

صاحبو! سندھ کے مسلمانوں کی حالت نہایت افسوسناک ہے۔ آج کل تمام ترقیات
کا مدار محض تعلیم پر ہے۔ جب سندھ میں تعلیم ہی نہیں تو جاننا چاہئے کہ کچھ بھی نہیں۔ جو لوگ
زمینداری پر نازاں ہیں، اگر انھوں نے تعلیم کی طرف توجہ نہ کی تو زمینداری کوئی دن کی
مہمان ہے کیونکہ جو لوگ ملک میں تعلیم یافتہ ہیں وہ رفتہ رفتہ اُن کی زمینوں پر قابض ہوتے
جاتے ہیں اور جس طرح سرکاری ملازمت سے مسلمان خارج ہو گئے ہیں اسی طرح

ہیں جو کسی قوم کی ترقی یا تنزل کی خبر دیتی ہیں۔ مگر سندھ کے عام مسلمان ان میں سے ہر ایک
حیثیت کے لحاظ سے نہایت پست حالت میں ہیں۔ اگرچہ اہل اسلام کی حالت تعلیم کے
لحاظ سے تمام ہندوستان میں بمقابلہ دیگر ابنائے وطن کے عموماً قابل افسوس ہے مگر سردار
صاحب اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ کسی صوبے کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت اس قدر
ابتر نہ ہوگی جیسی کہ یہاں کے مسلمانوں کی حالت ہے۔ بی اے پاس مسلمانوں کی تعداد انھوں
نے بمقابلہ دو سو ہندو گریجوٹس کے تمام سندھ میں صرف دس لکھی ہے۔ مگر میں نے سنا
ہے کہ ان دس میں ایک آدھ کے سوا سب کراچی کے غیر سندھی باشندے ہیں جو تجارت
کی غرض سے یہاں بود و باش رکھتے ہیں۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ڈاکٹری، سائنس
اور انجینرنگ میں بمقابلہ ۲۰ ہندوؤں کے صرف ایک مسلمان ڈگری یافتہ ہے۔ بیرسٹروں
اور ایل۔ ایل۔ بی پلیڈر اس صوبہ میں دو سو سے زائد ہیں، جن میں مسلمان صرف بیس
ہیں۔ اور منجملہ ایک سو بیس طلبہ کے جو گزشتہ سال انٹرنس کے امتحان میں کامیاب ہوئے
صرف ۱۲ مسلمان تھے۔ مجھے معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ سندھ کے مسلمانوں میں
صرف انگریزی تعلیم ہی کی کمی نہیں ہے بلکہ عربی، فارسی یہاں تک کہ سندھی زبان میں
بھی اُن کی تعلیم کا تقریباً ایسا ہی حال ہے۔ فیصدی ایک دو سے زیادہ نوشت و خواند
نہیں کر سکتے۔ برخلاف اس کے ہندوؤں میں نہ صرف انگریزی تعلیم کی ترقی ہے بلکہ
فارسی تعلیم بھی قدیم زمانے سے اُن میں چلی آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملازمت سرکاری
گویا ہندوؤں کا حصہ ہوگئی ہے سردار صاحب لکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں تعلیم کی کمی کے
سبب اُن کے ہاتھ سے ہر قسم کی سرکاری نوکریاں نکل گئی ہیں اور یہی حال پیشہ اور
صنعت و حرفت کا ہے۔ سندھ میں ایک ہندو صاحب سشن جج اور ایک اسسٹنٹ
جج ہیں مگر اس درجے کا کوئی عہدہ کسی مسلمان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ بیس سب
ججوں میں صرف ایک شخص مسلمان ہے اور محکمۂ مال میں منجملہ بیس ڈپٹی کلکٹروں کے

بھیجی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ اُن کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ اپنی زندگی میں کانفرنس کو یہاں نہ بلا سکے۔ لیکن ان کی وفات کے بعد اُن کے معزز جانشین جناب آنریبل خان بہادر شیخ صادق علی وزیر حال ریاست خیرپور سندھ نے اس منصوبے کو جو سردار صاحب مرحوم نے باندھا تھا بہ سرپرستی ہز ہائنس میر صاحب خیرپور سندھ بوجہ احسن پورا کیا ہے جس کا نتیجہ اس وقت ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

حضرات! اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی اطلاع کے لئے سردار صاحب مرحوم کی مذکورہ بالا رپورٹ اور نیز بعض دیگر بہی خواہانِ قوم کے بیان کا خلاصہ نہایت مختصر الفاظ میں آپ کے سامنے بیان کروں جس سے آپ سندھ کے مسلمانوں کی ترقی یا تنزل کا کسی قدر اندازہ کر سکیں۔ مذکورہ بالا ذریعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھ میں مسلمانوں کی آبادی بمقابلہ دیگر اقوام کے بہت زیادہ ہے۔ یعنی منجملہ ۳۲ لاکھ دس ہزار نو سو دس نفوس کے جو کہ سندھ میں آباد ہیں ۲۴ لاکھ ۶۴ ہزار ۴ سو ۸۹ یعنی تین چوتھائی سے زیادہ مسلمان ہیں۔ ۱۸۴۳ء میں جب کہ یہ ملک آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ میں آیا اُس وقت گیارہ سو برس سے زیادہ زمانہ اُس کو مسلمانوں کے تحت حکومت رہتے گذر چکا تھا۔ اب بھی تمام کاشتکار اور تمام جاگیردار مسلمان ہیں اور انگریزی عملداری سے پہلے تمام اراضی کے مالک مسلمان تھے۔ مسلمانوں کے سوا کسی قوم کے پاس ایک ایکڑ زمین بھی نہ تھی۔ البتہ اب مہاجنوں اور دیگر اقوام نے مختلف طریقوں سے زمین کا بہت سا حصہ حاصل کر لیا ہے لیکن اب بھی زمینداری کا بہت بڑا حصہ مسلمانوں ہی کے قبضہ میں ہے، یعنی تین چوتھائی سے زیادہ زمین مزروعہ مسلمانوں کی ملکیت میں ہے۔ مگر باوجود ان تمام فوقیتوں کے جو سندھ کے مسلمانوں کو اب تک حاصل ہیں جب ان کا حال اس معیار سے دیکھا جاتا ہے جو آج کل قوموں کی پستی اور عروج کا معیار ہے تو نہایت مایوسی ہوتی ہے۔ تعلیم، تجارت، صنعت و حرفت اور سرکاری ملازمت یہی وہ چیزیں

کا اکیسواں اجلاس ہے لیکن جو خصوصیت کہ ملک سندھ کو اسلام کے ساتھ ہے اس کے لحاظ
سے یہ ملک اس بات کا مستحق تھا کہ اہل اسلام کی کانفرنس کا سب سے پہلا اجلاس اس ملک میں ہوتا۔
عربی لٹریچر میں جس کثرت سے سندھ کا نام آتا ہے ہندوستان کے کسی دوسرے حصے کا نام
نہیں آتا کیونکہ ہندوستان میں جس حصہ سے عرب کو سب سے پہلے واقفیت ہوئی وہ یہی ملک
سندھ تھا۔ یہی وہ خطہ ہے جس کو سب سے پہلے محمد بن قاسم ثقفی نے پہلی صدی ہجری کے
اخیر میں فتح کر کے یہاں بنی امیہ کی سلطنت کا جھنڈا گاڑا اور گویا کہ مسلمان کشور کشاؤں
کے لئے ہندوستان کی آئندہ فتوحات کا دروازہ کھول دیا۔ یہی ملک ہے جہاں ہندوستان
میں سب سے پہلے علمائے اسلام کے حلقۂ درس قائم ہوئے اور فتح کے بعد ایک صدی میں
تمام خطہ محدثین و فقہا کی کثرت سے عراق و شام کا نمونہ بن گیا۔ یہی وہ سرزمین تھی جس کو عرب
اپنے اصلی وطن سے زیادہ عزیز سمجھنے لگے تھے۔ محمد بن قاسم کے حسن انتظام اور عمدگی قوانین
کی وجہ سے یہ ملک نہ صرف ریگستان ہونے کے لحاظ سے بلکہ دین و مذہب، مذاق و عادات
اور اوضاع و اطوار کی حیثیت سے بھی سرزمین عرب کی سچی تصویر بن گیا تھا اور جیسا کہ
حال کے ایک مشہور مصنف نے لکھا ہے اس نوجوان فاتح کی چند روز کی حکمرانی نے جو گہرا
اور پائدار نقش اہل سندھ کے دلوں پر جما دیا تھا ایسا نقش پٹھانوں اور مغلوں کی سلطنتیں
پانسو برس میں بھی نہیں جما سکیں۔ مگر افسوس ہے کہ جو حال ہندوستان کے عام مسلمانوں کی
غفلت اور بے پرواہی کا زمانۂ حال کی تعلیم کی طرف سے دیکھا جاتا ہے ویسا ہی بلکہ اس
سے بہت زیادہ سندھ کے مسلمانوں کا حال نظر آتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ابتدائے قیام
کانفرنس سے لے کر اب تک جس کو بیس اکیس برس کا عرصہ گذر چکا ہے کوئی تحریک ملک سندھ
کی طرف سے کانفرنس کے مدعو کرنے کے لئے نہیں ہوئی۔ سب سے پہلے سال گذشتہ میں آنریبل
سردار محمد یعقوب خاں مرحوم نے اس باب میں سلسلہ جنبانی کی تھی اور ایک مختصر رپورٹ
مسلمانان سندھ کی تعلیمی حالت کے متعلق قلمبند کر کے آنریری سکرٹری کانفرنس کے پاس

مسلمانوں میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ ہندوستان کا کوئی حصہ (الاماشاء اللہ) ایسا باقی نہیں رہا جہاں اس جواں مرد کہن سال کی کوشش اور حسن تدبیر سے کانفرنس کا قدم نہیں پہنچا۔ کلکتہ، مدراس، بمبئی اور ڈھاکہ جیسے دور دست مقامات میں پہنچ کر اُس نے کانفرنس کے اجلاس نہایت دھوم دھام اور تزک واحتشام کے ساتھ منعقد کئے اور مسلمانوں کی موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے عالی ہمتی اور جفاکشی کی ایک مثال قائم کردی۔

مدراس میں سوتوں کو جگایا جاکر | غل علم کا برہما میں مچایا جاکر
چھائی ہوئی مُردنی جہاں قوم میں تھی | وہاں آبِ حیات ان کو پلایا جاکر

افسوس ہے کہ اس وقت وہ ہم میں موجود نہیں ہے مگر اُس کی جدائی کا داغ بطور قائم مقام کے ہمارے دل میں موجود ہے اور اُس کی یاد نشتر کی طرح ہمارے سینے میں کھٹک رہی ہے۔ کئی سال سے نواب محسن الملک کی صحت نہایت نازک چلی آتی تھی اور نہایت شدید امراض نے اُن کو مغلوب کرلیا تھا مگر وہ ہر حالت میں برابر قوم کی خدمت کرتے رہے اور بیماریوں سے ہمیشہ لڑتے رہے۔ یہاں تک کہ اُن کا وقت آپہنچا اور قوم اُن کی جلیل القدر خدمات سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

جس وقت کا کھٹکا تھا وہ وقت آگیا آخر | یاروں پہ مصیبت کا سماں چھا گیا آخر
وہ ملک کا محسن وہ مسلمانوں کا غمخوار | سر کرکے مہم قوم کی کام آگیا آخر
سید کا بدل قوم کو مشکل سے ملا تھا | اس کو بھی وہی قوم کا غم کھا گیا آخر
رہنا تھا زبس قوم کی تقدیر میں بے کس | لکھا ہوا تقدیر کا پیش آگیا آخر
نکبت کا پتہ ڈھونڈتا پھرتا تھا مقدر | نکبت کا مقدر کو پتہ پا گیا آخر
جیتا تھا تو لوگوں کو گماں اس پہ تھے کیا کیا | پر مر کے خلوص اپنا وہ منوا گیا آخر
جو خندہ زنی کرتے تھے ہر کام پہ اُس کے | وہ خون کے آنسو انھیں رلوا گیا آخر

ہے کہ سر سید احمد خاں مرحوم نے ۱۸۸۶ء میں بعد قیام مدرسۃ العلوم علیگڈھ کے اس کانفرنس کی بنیاد اس لئے ڈالی تھی کہ اس کے ذریعہ سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کی منادی کی جائے۔ چنانچہ اُس قوم کے فدائی نے باوجود کبرسن اور طرح طرح کے موانع اور معذوریوں کے جس طرح اول کالج کے لئے لمبے لمبے سفر کئے۔ اسی طرح ملک کے مختلف مقامات میں خود پہنچ کر کانفرنس کے اجلاس منعقد کرائے اور ایک حد تک تعلیم کی منادی اطراف وجوانب میں کر کے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔ لیکن اس مرحوم کی زندگی میں کانفرنس کا دورہ صرف پنجاب اور ممالک متحدہ کے چند خاص خاص شہروں میں محدود رہا۔ مگر ان کی وفات کے بعد جب کہ تمام قوم پر مایوسی چھائی ہوئی تھی اور کالج اور کانفرنس بلکہ تمام قومی کاموں کی طرف سے مختلف قسم کے تردد آمیز خیالات دلوں میں موج زن تھے، خدائے تعالیٰ نے اپنی رحمتِ کاملہ سے قوم کی کشتی بانی کے لئے ایک ایسے شخص کو کھڑا کر دیا جس نے کالج اور کانفرنس دونوں کے حق میں فی الحقیقت مسیحائی کا کام دیا اور قوم کے مردہ اور افسردہ دلوں میں از سرِ نو جان ڈال دی اور پانسو برس کے بعد لسان الغیب کی یہ بشارت پوری ہوئی کہ

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید　　دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا میکرد

آپ سب صاحب سمجھ گئے ہوں گے کہ اس قوم کے مسیحا سے میری کیا مراد ہے۔ خدائے تعالیٰ نواب محسن الملک کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے، انھوں نے کالج اور کانفرنس کو سر سید رحمۃ اللہ علیہ کے بعد صرف اپنی قدیم حالت ہی پر قائم نہیں رکھا بلکہ چند سال کے عرصہ میں دونوں کی بالکل کایا پلٹ دی اور اُن کو اس درجہ تک پہنچا دیا جو امید و توقع اور وہم وگمان سے بالاتر تھا۔ نواب محسن الملک کے عہد میں جو غیر مترقبہ ترقیات کالج کو نصیب ہوئیں اُن کی تفصیل بہت طولانی ہے جس کے بیان کرنے کا یہ محل نہیں ہے مگر جو وسعت اور عام قبولیت کانفرنس کو اُن کی بدولت حاصل ہوئی وہ بھی ایک کارنامہ ہے جو

۹۔ تقریر صدارت

(از علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ مورخہ ۴ جنوری ۱۹۰۸ء)

دسمبر ۱۹۰۷ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جو سالانہ اجلاس کراچی میں منعقد ہوا تھا۔ مولانا اس کے پریسیڈنٹ تھے۔ نیچے وہ تقریر درج کیجاتی ہے جو آپ نے اس موقع پر صدارتی حیثیت سے فرمائی

حضرات! جو عزت کہ آج مجھکو آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کا پریسیڈنٹ بنانے سے دی گئی ہے جہاں تک غور کیا جاتا ہے اس کی کوئی معقول وجہ اس کے سوا خیال میں نہیں آتی کہ چونکہ سندھ میں انگریزی تعلیم گویا بالکل مفقود ہے اس لئے شاید یہ مناسب سمجھا گیا ہے کہ اس موقع پر صدر انجمن ایک ایسے شخص کو بنایا جائے جو انگریزی کا ایک حرف نہ جانتا ہو ورنہ میں اپنے تئیں ہرگز اس جلیل القدر منصب کے لائق نہیں سمجھتا۔ لیکن ہر حال میں اس عزت افزائی کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد میں نہایت ادب سے تمام حاضرین کی خدمت میں التماس کرتا ہوں کہ اس عظیم الشان خدمت کے ادا کرنے میں میری کم لیاقتی کے سبب جو فروگذاشت یا کوتاہی ظہور میں آئے اُس سے درگذر فرمائی جائے اور آج کی صدارت کو اُن عالی درجہ اور عالی مقام بزرگوں کی صدارت کے پیمانہ سے نہ جانچا جائے۔ جو گذشتہ اجلاسوں میں اس معزز کرسی پر جلوس فرما چکے ہیں۔

صاحبو! پہلے اس سے کہ کانفرنس کے اصلی مقصد کے متعلق کچھ بیان کیا جائے میں چند الفاظ اُس دردناک واقعہ کی نسبت عرض کرنا چاہتا ہوں جس سے نہ صرف ہماری قوم کو بلکہ خاص کر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو بھی نہایت سخت صدمہ پہنچا ہے۔ آپ کو معلوم

کرے، جو غلطی ہو اس کی اصلاح کرے اور جو بات لائبریری کے حق میں مفید ہو اس کے
لئے سکرٹری یا محرر کو ہدایت کرے۔ اس سے زیادہ لائبریری کی طرف سے صاحب
ڈپٹی کمشنر بہادر اور نیز پبلک کا اور کیا اطمینان ہو سکتا ہے۔ ہم اس بات کو تسلیم کرتے
ہیں کہ لائبریری کا انتظام ابھی ابتدائی حالت میں ہے اور بہت کچھ اصلاح طلب ہے،
اس کے قواعد بھی ابھی تک مکمل نہیں ہوئے مگر زیادہ تر اس کا سبب یہ ہے کہ
سکرٹری ایک نہایت ضروری کام کے لئے چھ مہینے تک لائبریری سے غیر حاضر رہا
اور اس کی عدم موجودگی میں بہت سے کام بند رہے یہاں تک کہ کتابوں کی خریداری
بالکل موقوف ہو گئی۔ مگر اب امید ہے کہ قواعد بھی مکمل ہو جائیں گے اور کتابوں کی
خریداری بھی جاری ہو جائے گی۔

سے ادا کیا ہے۔ ایسی لائبریری کو پبلک کے ہاتھ سے نکال کر میونسپل کمیٹی کے ہاتھ میں دیدینا یقیناً اُن کی دل شکنی کا باعث ہوگا۔

(۵) لائبریری ابھی بالکل ابتدائی حالت میں ہے اور ہماری یہ آرزو ہے کہ اس کو اس درجہ تک ترقی دیجائے جو حضور ملکہ معظمہ کی یادگار کے شایاں ہو لیکن میونسپل کمیٹی کے ہاتھ میں جانے کے بعد ہم کو امید نہیں ہے کہ ہماری یہ آرزو پوری ہو سکے۔ میونسپل کمیٹی کے ذمہ پہلے ہی رفاہ عام کے بہت سے کام ہیں، وہ زیادہ سے زیادہ لائبریری کو اپنی نگرانی میں حالت موجودہ پر قائم رکھ سکتی ہے لیکن اس کو ترقی دینا اور اس کے لئے ہر علم و فن اور ہر زبان کی کتابیں مہیا کرنا اور بک سیلروں سے خط وکتابت کرنا اور اُس کا حساب کتاب صاف رکھنا اور اُس کی جانچ پڑتال کرنا اُس کی طاقت سے باہر ہے۔

(۶) بے شک ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایک ایسے پبلک فنڈ کی طرف سے جیساکہ وکٹوریہ میموریل فنڈ ہے ضلع کے حاکم اعلیٰ کو مطمئن کرنا اور اُس کا حساب کتاب ہر وقت صاف رکھنا کمیٹی لائبریری کا فرض ہے۔ چنانچہ اسی خیال سے ہم نے صاحبان ڈپٹی کمشنر کو (جو کوئی ہو) لائبریری کا پیٹرن یعنی مربی و سرپرست ہمیشہ کے لئے قرار دیا ہے اور اس کی اطلاع ہم جناب ٹامسن صاحب بہادر کو گزشتہ موسم سرما میں دے چکے ہیں اور انھوں نے بخوشی پیٹرن ہونا منظور کر لیا ہے۔ اور اب ان کی عدم موجودگی میں جناب آس بورن صاحب بہادر قائم مقام ڈپٹی کمشنر ہماری کمیٹی کے پیٹرن ہیں۔ اس کے سوا تحصیلدار صاحب اور آٹھ ممبر میونسپل کمیٹی کے ہماری کمیٹی کے بھی ممبر ہیں۔ اور ہیڈ ماسٹر صاحب بورڈ اسکول جو کہ ایک معزز عہدہ دار سرکاری ہیں اور سکرٹری میونسپل کمیٹی دونوں ہماری کمیٹی میں سکرٹری شپ کا کام انجام دیتے ہیں۔ مذکورہ بالا تمام عہدیدار اور شہر کا ہر فرد بشر جس نے میموریل فنڈ میں کم یا زیادہ چندہ دیا ہے ہر وقت اختیار رکھتا ہے کہ لائبریری کے انتظام کو آکر دیکھے، اس کے رجسٹروں کو ملاحظہ

انھیں پبلک لائبریریوں کا صدقہ ہے۔ ہمارے قصبہ کے اکثر اصحاب اس لائبریری کو بالکل بے سود اور نکمی چیز سمجھتے ہیں اور کتابوں کے خریدنے میں جو روپیہ صرف ہوتا ہے اُس کو روپیہ کا ضائع کرنا جانتے ہیں۔ سبب یہ ہے کہ نیا کام کیسا ہی مفید ہو اول اول لوگ اس سے ہمیشہ وحشت اور نفرت کیا کرتے ہیں۔ سنا ہے کہ یورپ میں جب گھنٹہ ایجاد ہوا تو جس شخص نے سب سے پہلے اس کو خرید کر اپنے کمرے میں رکھا اُس کو تمام رات گھنٹے کی کھٹ کھٹ سے نیند نہ آئی۔ مگر رفتہ رفتہ وہ اس کی آواز سے ایسا مانوس ہوگیا کہ اُس کے بغیر اس کو نیند نہ آتی تھی۔ جب پانی پت میں اول ہی اول مدرسہ قائم ہوا تو بہت ہی کم لوگ اس میں اپنی اولاد کو تعلیم کے لئے بھیجتے تھے مگر اب ہر شخص کی یہ آرزو ہے کہ یہاں بجائے مڈل اسکول کے ہائی اسکول قائم ہوجائے۔ اسی طرح اول اول شفاخانہ میں بہت ہی کم لوگ علاج کے لئے جاتے تھے مگر اب لوگ یہ چاہتے ہیں کہ شہر میں دو شفاخانے جاری ہوجائیں اور بڑے شفاخانہ میں ہوسپٹل اسسٹنٹ کی جگہ اسسٹنٹ سرجن مقرر کیا جائے۔ امید ہے کہ اسی طرح ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ اس لائبریری کو شہر کے حق میں ایک چشمۂ فیض سمجھیں گے اور گو اس وقت ہم نہ ہوں گے مگر جن لوگوں کی کوششوں سے یہ لائبریری قائم ہوئی ہے ہمارے بعد اُن کی دل سے قدر کریں گے اور اُن کو شہر کا خیر خواہ سمجھیں گے۔

اب میں اصل مطلب جس کے لئے آپ کو یہاں آنے کی تکلیف دی گئی ہے بیان کرتا ہوں۔ ایک روبکار محکمۂ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر سے بنام صاحب پریزیڈنٹ میونسپل کمیٹی مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۶ء اس مضمون کی صادر ہوئی ہے کہ چونکہ لائبریری کی ذمہ داری ممبران میونسپل کمیٹی کے سپرد کی گئی ہے ان کو چاہئے کہ کمیٹی اول لائبریری کا چارج لے لے اور پھر ایک سب کمیٹی مقرر کرے جس میں ۴ یا ۵ ممبران لائبریری کے لئے مقرر کئے جائیں۔ اسی روبکار میں کمیٹی سے ایک ایسا نقشہ طلب کیا گیا ہے

روپے سے ایک کتب خانہ شہر میں قائم کیا جائے جس سے تمام باشندے برابر فائدہ اٹھا سکیں۔
اس رائے کو جناب ٹامسن صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر اور جناب آغا سید جلال شاہ صاحب
تحصیلدار نے بھی پسند کیا۔ اور چونکہ سنہ[1] میں ڈرینٹ صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر سابق کی
تجویز سے کتب خانہ کے واسطے یہ مکان کئی ہزار کی لاگت سے تیار ہو چکا تھا اور اس کی
تیاری میں بھی پبلک ہی کا روپیہ جو جوبلی کے اخراجات سے بچ رہا تھا خرچ ہوا تھا اس لئے
۱۹۰۵ء میں یہ کتب خانہ اس مکان میں قائم کیا گیا۔ چونکہ اس قصبہ میں ایک عام کتب خانہ
کا قائم ہونا جس سے ہر پڑھا لکھا آدمی فائدہ اٹھا سکے بالکل ایک نئی بات ہے اس
لئے اصل مطلب بیان کرنے سے پہلے میں کتب خانہ کے فوائد کے متعلق چند الفاظ آپ
کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ صرف
اس قدر ہوتی ہے کہ طالب علم اپنی تعلیم پوری کرنے کے بعد اگر کسی علم یا فن میں کمال حاصل
کرنا چاہے تو کتابوں کے مطالعہ سے بغیر استاد کی مدد کے کمال حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن
جب تک کتابوں کا معقول ذخیرہ موجود نہ ہو کسی علم کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اسی واسطے
یورپ میں کوئی چھوٹے سے چھوٹا گانوں بھی ایسا نہیں پایا جاتا جس میں کم سے کم ایک
یا دو عام کتب خانے موجود نہ ہوں۔ یہ کتب خانے لوگوں کے عام چندہ سے قائم کئے
جاتے ہیں اور بستی کا ہر ایک باشندہ اُن سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ایسے کتب خانہ کو
پبلک لائبریری کہتے ہیں۔ یورپ میں جو ہمیشہ بڑے بڑے عالم اور مصنف اور موجد اور
صناع پیدا ہوتے رہتے ہیں اور وہاں کے تمام ملکوں میں علم کا دریا بہتا نظر آتا ہے وہ

(۱) مولانا کے اپنے لکھے ہوئے جس مسودہ سے یہ تقریر نقل کی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ اس میں
سنہ کی جگہ چھوٹی ہوئی تھی۔

۸۔ تقریر متعلق وکٹوریا میموریل لائبریری پانی پت

(قلمی مسودہ سے نقل کیا گیا)

ملکۂ وکٹوریا آنجہانی کے انتقال پر باشندگانِ پانی پت نے کچھ روپیہ ملکہ کی کسی یادگار کے قائم کرنیکے لئے جمع کیا تھا۔ مولانا کی تحریک سے ایک پبلک لائبریری پانی پت میں اُس روپے سے قائم کی گئی اور مولانا اُس کے سکرٹری بنائے گئے۔ یہ تقریر اُسی لائبریری کے متعلق مولانا نے باشندگانِ پانی پت کے ایک عام جلسہ میں فرمائی تھی۔

جناب صدر انجمن و جملہ حاضرین جلسہ!

آپ سب صاحبوں کو آج اس جلسہ میں ایک ایسے کام کے لئے تکلیف دی گئی ہے جو تمام قصبہ کی بھلائی سے علاقہ رکھتا ہے۔ اور قصبہ کا ہر ایک باشندہ اس میں رائے دینے کا حق رکھتا ہے۔ آپ صاحبوں کو معلوم ہے کہ حضور ملکہ معظمہ مرحومہ کی وفات پر شہر کے تمام باشندوں نے نہایت جوش و وفاداری سے اُس نیک دل ملکہ کی (جس کی نیکی تمام دنیا میں مشہور ہے) ایک علمی یادگار قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ چنانچہ اس کام کے لئے عام چندہ کی فہرست کھولی گئی اور شہر کے عام باشندوں نے نہایت کشادہ پیشانی سے اس میں اپنی اپنی حیثیت اور مقدور کے موافق چندہ دیا۔ یہاں تک کہ چندہ کی تعداد کچھ اوپر تین ہزار تک پہنچ گئی۔ اولاً سب کی یہ رائے تھی کہ قصبہ میں جو مڈل اسکول ہے اس کو بیادگار ملکہ مرحومہ دو جماعتیں اور اضافہ کرکے ہائی اسکول بنا دیا جائے۔ مگر چونکہ میونسپل کمیٹی کی امداد بغیر ہائی اسکول قائم ہونا ممکن نہ تھا اور کمیٹی میں اُس وقت روپے کی کمی تھی، اس لئے وہ تجویز پوری نہ ہوسکی۔ آخر یہ رائے قرار پائی کہ چندہ کے

انھیں سے سے گر ہے شرف آدمی کو

انھیں سے ہے سرسبز ہر قوم و ملّت — انھیں سے ہے آباد ہر ملک و دولت
انھیں کی ہے سب ربعِ مسکوں میں برکت — انھیں پر ہے موقوف قوموں کی عزت

دم ان کا ہے دنیا میں رحمت خدا کی
انھیں کو ہے پھبتی خلافت خدا کی

انھیں کی ہے یہ روشنی دشت و در میں — انھیں کا اجالا ہے ہر رہ گذر میں
انھیں کے کرشمے ہیں سب بحر و بر میں — انھیں کا ظہور ہے سب خشک و تر میں

انھیں سے یہ رتبہ تھا آدم نے پایا
کہ سر اُس سے روحانیوں نے جھکایا

تھی، اُس کا مقصد بھی یہی تھا کہ ہندوستانی اپنے حقوق کی خواہش اور اپنے درد دل اور اپنی شکایتوں کے اظہار کے لئے براہ راست پارلیمنٹ اور گورنمنٹ ہند سے تعلق پیدا کریں۔ مگر چونکہ ملک میں اُس کے چلانے کی قابلیت نہ تھی اس لئے سرسید نے آخر کار اُس کا خیال چھوڑ دیا اور اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ جب تک ہندوستانیوں میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم نہ پھیلے گی اُس وقت تک یہ تمام سوسائٹیاں اور انجمنیں اور ایسوسی ایشن بے سود ثابت ہوں گی۔ چنانچہ ولایت سے واپس آکر اُنھوں نے تعلیم کی بنیاد ڈالی اور اُس کی ترقی میں فوق العادۃ کوششیں کیں جن سے آپ سب صاحبان بخوبی واقف ہیں اور جو اُن کی زندگی کا ایک بہت بڑا عظیم الشان کام ہے جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ مگر ایک دلچسپ فقرہ جو ٹائمز آف لندن میں اُن کی وفات کے بعد اُن کی تعلیمی کوششوں کے متعلق چھپا تھا اُس کا اس موقع پر نقل کرنا غیر مناسب نہ ہوگا۔ اُس میں سرسید کے بڑے بڑے کاموں کی تفصیل بیان کرنے کے بعد لکھا تھا کہ اس شخص نے ہندوستان کے مسلمانوں کے بیدار کرنے اور ان کو اپنے تنزل اور خاص کر تعلیم کے ضروری معاملہ کا خیال دلوانے میں بہت محنت اور جانفشانی فرمائی اور فی الحقیقت جب اس معاملہ میں ان کی عمر بھر کی لگاتار کوششوں اور تعجب انگیز کامیابیوں کو دیکھا جاتا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کا پیغمبر کہا جائے۔

صاحبو! یہ جو کچھ میں نے بیان کیا یہ اُس مرحوم کی ملکی اور قومی خدمات کا ایک نہایت مختصر بیان تھا جو محض بطور نمونہ کے حاضرین کی خدمت میں عرض کیا گیا۔ مگر اب تک میں نے اُن کی مذہبی خدمات کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ اُن کی مذہبی خدمات کی میرے دل میں کچھ عظمت نہیں ہے۔ میرے نزدیک اُن کی زندگی کا سب سے بڑا کام خطبات احمدیہ اور تفسیر القرآن کا لکھنا ہے۔ مگر اے صاحبو! ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ اُن کی مذہبی خدمات کی جیسی کہ چاہئے مسلمانوں میں قدر ہو۔ مذہبی خیالات کا یقین

اپنی رائے اس معاملہ پر ظاہر کی۔ یہ بات محتاج بیان نہیں ہو کہ حکمران گروہ میں اُس کی رائے نے نہایت اثر پیدا کیا۔ وہ ان اسباب کے بیان کرنے سے خائف نہیں ہوا جن کی طرف غدر کو بخوبی منسوب کیا جاسکتا ہے اور جن کی صحت تجربہ سے پورے طور پر ثابت ہو چکی ہے"

مذکورہ بالا ریمارکس سے ظاہر ہو کہ جو اثر صرف ایک شخص کی تحریر نے ایسے غیظ و غضب کے زمانہ میں جیسا کہ غدر کے بعد کا زمانہ تھا گورنمنٹ اور پارلیمنٹ کے خیالات پر اس قدر جلد کیا تھا ویسا اثر نیشنل کانگرس نے جو ہندوستان کے لائق ترین اشخاص کا مجمع ہے اپنی پندرہ برس کی چیخ پکار اور شور و غل سے نہیں کیا۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ سر سیّد نے اپنی شکایتوں سے گورنمنٹ اور پارلیمنٹ کے سوا کیا ہندوستانی اور انگریز کسی متنفس کو مطلع نہیں کیا۔ اور کانگرس کے ممبران نے پچاس ہزار رسالے جن میں گورنمنٹ کی سرتا پا شکایتیں درج تھیں، ہندوستان کی بارہ زبانوں میں ترجمہ کرا کر ملک میں عام طور پر تقسیم کئے جن کی نسبت لارڈ ڈفرن نے ایک اسپیچ میں کہا تھا کہ "کانگرس کے ممبر لاکھوں ناواقف اور زود اعتقاد شخصوں میں اُن رسالوں کے تقسیم کرنے کے جوابدہ ہوئے جو نہایت مشتبہ نیت کے ساتھ لکھے گئے تھے اور جن کا مقصد صریح سرکاری افسروں کے برخلاف لوگوں کی عداوت کا برانگیختہ کرنا تھا"

بہرحال اگر بالفرض نیشنل کانگرس کے مقاصد اور اُس کی خواہشوں کو سراسر واجبی اور ملک کے حق میں مفید تسلیم کر لیا جائے تو بھی اس نے اب تک سر سید کے ایک نفس واحد سے کوئی زیادہ بات اس کے سوا نہیں کی کہ جس گرہ کو سر سید نے ہاتھوں سے کھولا تھا اُس کو کانگرس نے دانتوں سے کھولنے کا ارادہ کیا اور اسی لئے اس کو بہت ہی کم کامیابی ہوئی۔

برٹش انڈین ایسوسی ایشن جو سر سید نے ۱۸۶۶ء میں بمقام علیگڈھ آ کر قائم کی

گورنمنٹ نے بہت جلد کیا۔ کتاب مذکور کے پیش ہونے سے ایک برس بعد یعنی ۱۸۶۲ء میں پہلی ہی بار پنڈت شمبو ناتھ ہائی کورٹ کلکتہ کے جج مقرر ہوئے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ اکثر اعلیٰ عہدے جو پہلے کبھی ہندوستانیوں کو نصیب نہیں ہوئے تھے، ملنے لگے۔

اُسی نے شمالی ہندوستان میں سوسائٹیاں اور انجمنیں اور سبھائیں قائم کرنی لوگوں کو بتلائیں۔ سائنٹفک سوسائٹی علیگڈھ سے پہلے جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے کہ کوئی قومی مجلس یا سوسائٹی اودھ، اضلاع شمال مغرب اور پنجاب میں ایسی نہیں تھی جو مسلمانوں یا ہندؤں نے ملک یا قوم کی بھلائی کے لئے قائم کی ہو خصوصاً مسلمانوں میں ایک مجلس کے سوا جو کلکتہ میں مجلس مذاکرہ علمیہ کے نام سے قائم تھی اُس وقت تک کوئی مجلس ہندوستان کے کسی صوبہ میں قائم نہیں ہوئی تھی۔

اُسی نے دیسی اخباروں کو جن میں جھوٹی سچّی خبروں کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تھا پولٹیکل، سوشل اور علمی و اخلاقی مضامین کا مخزن بنایا اور بجائے اس کے کہ وہ محض لوگوں کے دل بہلانے کے اوزار تھے ان کو اس قابل بنا دیا کہ گورنمنٹ اُن کی آواز پر کان لگانے لگی

اُسی نے اُردو لٹریچر اور اردو زبان کو ایک قطرہ سے دریا بنا دیا۔ قطع نظر اُس بے بہا امداد کے جو خود سر سید کے لٹریری ورکس سے اُردو لٹریچر کو پہنچی اور قطع نظر گرانقدر کوششوں کے جو انھوں نے اُردو زبان کی حمایت میں اخیر دم تک برابر جاری رکھیں، اگر سچ پوچھو تو ۱۸۶۶ء سے اب تک جو اُردو زبان نے غیر معمولی ترقی کی ہے وہ اُسی مرحوم کی تحریکوں کا نتیجہ تھا۔ سوسائٹی کی طرف سے جو ایڈریس انھوں نے سنہ مذکور میں بحضور سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال مغرب علیگڈھ میں پیش کیا تھا اُس ایڈریس کے جواب میں سوسائٹی کی درخواست کے موافق ہز آنر نے وعدہ کیا تھا کہ جو کتابیں دیسی زبان میں تصنیف و تالیف یا ترجمہ کی جائیں گی، اُن میں گورنمنٹ ضرور

مسلمانوں کے ساتھ یقیناً بڑی ہمدردی پیدا ہوگئی تھی۔ جیسا کہ ان کو اس برتاؤ سے، جو اس واقعہ کے بعد سرسید اور مسلمانوں کے ساتھ ان سے ظہور میں آیا، ثابت ہوتا ہے۔ انھوں نے مدرسۃ العلوم کی پختہ بارک میں ایک کمرہ بنانے کے لئے ڈیڑھ ہزار روپیہ اپنی جیب خاص سے دیا اور ۱۸۸۲ء میں جبکہ وہ ایجوکیشن کمیشن کے پریزیڈنٹ تھے کمیشن کے دورہ کے وقت اضلاع شمال مغرب میں پہلا اجلاس علیگڈھ میں کیا۔ اور اپنی آخری اسپیچ محمڈن کالج میں آکر دی جس میں نہایت بشاشت اور کشادہ دلی کے ساتھ سرسید اور اُن کی کوششوں کی بے انتہا تعریف کی اور کالج کے سرسبز ہونے کی تمنا ظاہر کی۔

سرسید کی کوشش سے جو اعتبار حکمران قوم کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے پیدا ہوا ہے اُس کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ انگلستان کے مشہور اخبار پال مال گزٹ مورخہ ۲۹ مارچ ۱۸۹۸ء میں سرسید کی وفات پر یہ فقرہ لکھا تھا کہ "سرکار انگریزی اور باشندگان ہند کے تعلقات کی کتاب میں کوئی باب ایسا نہیں ہے جس پر ہم دل سے اپنے تئیں مبارکباد دے سکیں جس قدر سرسید احمد خاں کی زندگی پر دے سکتے ہیں۔ وہ ابتدائے عمر سے آخر دم تک انگریزی راج کا سچا دوست رہا اور جو اُس نے خدمتیں کیں اُن کی قدر وقیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہوگا۔"

اسی طرح سر آکلنڈ کالون نے جیسا کہ مسٹر تھیوڈور بیک نے سرسید کے ماتمی جلسہ میں بیان کیا تھا لفٹننٹ گورنری کے زمانہ میں اس مرحوم کی نسبت یہ فرمایا تھا کہ "کسی زندہ شخص نے عام اس سے کہ وہ انگریز ہو یا ہندوستانی برٹش گورنمنٹ کے استحکام سلطنت ہندوستان کے بارہ میں اس قدر کوشش نہیں کی ہے جس قدر کہ سرسید نے کی ہے۔"

ظاہر ہے کہ سرسید نے نہ کسی ملکی معاملہ میں کوئی سفارت کی خدمت انجام دی تھی نہ کوئی ملک فتح کیا تھا نہ کوئی کالونی آباد کی تھی نہ کسی صوبہ کا بندوبست کیا تھا پھر وہ کونسی خدمت اور کونسی کوشش سرسید نے کی تھی جس کا ذکر انگلستان کے اس نامور اخبار نے اور

ان کو مٹایا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر ہنٹر نے جو کچھ اپنی کتاب "آور انڈین مسلمانز" میں مسلمانوں کے برخلاف لکھا تھا بڑے بڑے جلیل القدر حاکموں نے اس کی تردید کی۔ پایونیر میں ایک بڑے لائق عربی داں انگریز کا بہت بسوط آرٹکل جس کی نسبت یقین کیا گیا تھا کہ سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال مغرب کا لکھا ہوا تھا، انھیں دنوں میں شائع ہوا۔ اس میں صاف لکھا تھا کہ وہابیوں کو یہ کہنا کہ وہ ہمیشہ درپردہ تخریب سلطنت کی فکر میں رہتے ہیں اور چپکے چپکے منصوبے باندھا کرتے ہیں اور غدر و بغاوت کی تحریک کرتے ہیں (جیسا کہ ڈاکٹر ہنٹر نے لکھا تھا) محض تہمت ہے" سر الیفرڈ لائل نے اپنے ایک ایسے میں جو تھیالوجیکل ریویو میں لکھا کہ اُس مصنف کو مبالغہ کا جن بسا اوقات نہایت پریشان کر دیتا ہے اور بہتر ہوتا اگر وہ اس جن کو اتار دیتا" انڈین آبزرور کے ایڈیٹر نے جو خود انگلش مین تھا اور اس کا اخبار تمام اینگلو انڈین افسروں کی رائے کا آئینہ تھا جب سرسید کا ریویو کتاب مذکور کے برخلاف شائع ہوا تو ایک نہایت زبردست آرٹکل سرسید کی تائید میں لکھا جس میں درحقیقت ڈاکٹر ممدوح کی کتاب کی دھجیاں اُڑائی تھیں اور جس کا پہلا فقرہ یہ تھا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا کے لوگوں نے یا دنیا میں سے اس گروہ کے لوگوں نے جو اس قسم کی باتوں سے سروکار رکھتے ہیں ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب متعلقہ مسلمانان ہندوستان کی قدر و منزلت کی بابت بلکہ ٹھیک ٹھیک یہ کہنا اچھا ہے کہ اُس کے لچر و پوچ ہونے کی بابت تصفیہ کر دیا ہے۔ جہاں تک کہ ہم کو لٹریچر میں مداخلت ہے اس کے اعتبار سے ہم ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کو لاثانی سمجھتے ہیں، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ کسی مصنف نے دیدہ و دانستہ ایسے مضمون پر کتاب چھاپی ہو جس سے وہ بالکل ناواقف ہو۔

سرسید کے ریویو کا اثر جو کچھ کہ گورنمنٹ پر ہوا اُس کا اندازہ جیسا کہ معتبر ذریعہ سے سنا گیا ہے اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس ریویو کے شائع ہونے کے بعد پھر کوئی وہابی گرفتار نہیں ہوا، حالانکہ کئی برس سے ان کی گرفتاری برابر جاری تھی۔ خود ڈاکٹر ممدوح کے خیالات جہاں تک کہ قیاس ہو سکتا ہے سرسید کا ریویو دیکھنے کے بعد بدل گئے تھے اور ان کو

شخص نے کبھی ہمت نہ ہاری، یہاں تک کہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوا۔ اس نے ایک جماعت کثیر مسلمانوں میں ایسی پیدا کر دی جو انگلش گورنمنٹ کی برکتوں کی دل سے قدر کرتی ہے، اس کو ہندوستان کے حق میں اور خاص کر مسلمانوں کے حق میں خدا کی مہربانی سمجھتی ہے اور اس بات کا یقین رکھتی ہے کہ اگر ہندوستان میں انگریزوں کا قدم نہ آتا تو مسلمانوں کو وہی روز سیاہ دیکھنا پڑتا جو اسپین کے مسلمانوں کو اُن کی سلطنت کے زوال کے بعد دیکھنا پڑا تھا۔ وہ اپنی سلامتی بلکہ اپنا وجود ہندوستان میں محض انگریزی حکومت کی بدولت جانتے ہیں، ان کو اپنے اسلاف کی اقبالمندی کے خواب نظر آنے موقوف ہوگئے ہیں، وہ اپنی حالت اور حیثیت کو خوب سمجھ گئے ہیں، اُنھوں نے برٹش گورنمنٹ کی طاقت اور اقتدار کا بخوبی اندازہ کر لیا ہے، ان کو یقین ہے کہ ہندوستان میں کوئی قوم انگریزوں کے سوا حکومت نہیں کر سکتی اور اس لئے وہ اپنی خیر اسی میں سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں گورنمنٹ کی وفادار اور خیر خواہ رعایا بن کر رہیں۔

سرسید نے صرف یہی نہیں کیا کہ اپنی پر زور تحریروں اور تقریروں سے مسلمانوں کی ایک جماعت کے خیالات کی اصلاح کر دی ہو بلکہ وہ اپنی قوم میں وفاداری اخلاص اور اطاعت کا ہمیشہ کے لئے بیج بو گیا ہے۔ وہ اُن کی آئندہ نسلوں کے لئے ایک ایسا بارآور درخت لگا گیا ہے جس کا پھل انگلش نیشن کی محبت اور انگلش گورنمنٹ کی وفاداری اور فرمانبرداری ہے ؎

بو کہ آبِ رفتہ در جوئے شما آید زسر ... کوہ ہا کندست تا ایں جوئے شیر آوردہ است

جس طرح اُس نے قوم کے خیالات کی اصلاح کی اور اُن میں ہمیشہ کے لئے وفاداری اور اخلاص کی بنیاد ڈالی اسی طرح اُس نے حکمراں قوم کی نظر میں جہاں تک کہ ممکن تھا اُن کا اعتبار بڑھانے میں کوشش کی اور وہ تمام شکوک و شبہات جو انگریزوں کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے پیدا ہوگئے تھے اور جو بظاہر کسی طرح مٹنے والے نہ تھے

صاحب نے اپنی کتاب "آور انڈین مسلمانز" میں صاف لکھا تھا کہ "ہندوستان کے مسلمان اب بھی ہندوستان میں گورنمنٹ انگریزی کے لئے موجب خطر ہیں جیسے کہ ایک مدت سے موجب خطر چلے آتے ہیں"۔

صاحبو! میں اس موقع پر سرسید کی ان کوششوں کی تفصیل بیان کرنی نہیں چاہتا جو انھوں نے مسلمانوں پر سے اس داغ کے چھٹانے میں کی ہیں۔ کیونکہ وہ ۱۸۵۷ء سے لے کر آخری وقت تک جو اکتالیس برس کا زمانہ ہوتا ہے برابر اسی دھن میں لگے رہے ہیں کہ قوم کی پولیٹیکل حالت درست ہو، گورنمنٹ میں اُنکا اعتبار زیادہ ہو، انگریزوں میں اور اُن میں ربط و اتحاد کو ترقی ہو اور وہ اپنی ہموطن قوموں سے عزت میں مرتبہ میں اور گورنمنٹ کا معتمد علیہ ہونے میں کسی طرح پیچھے نہ رہیں۔ اس غرض سے جو جو کام اور جو جو کوششیں اُنھوں نے اس اکتالیس برس کے عرصہ میں کی ہیں اُن کی تفصیل بہت طولانی ہے۔ یہاں تک کہ میرے نزدیک ایک شخص کا ہرگز کام نہیں کہ اُن کی قومی خدمات کو بالاستیعاب اُن کی لائف میں بیان کرسکے۔ مگر جہاں تک کہ امکان میں تھا ان خدمات کا مفصل ذکر اُن کی لائف میں کیا گیا ہے جو عنقریب پبلک کی نظر سے گذرنے والی ہے۔ پس میں اس ذکر کو چھوڑ کر صرف ان نتائج کو بیان کرنا چاہتا ہوں جو اس مرحوم کی کوششوں سے ملک اور قوم کے حق میں مترتب ہوئے۔

صاحبو! جس کام کا بیڑا سرسید نے اٹھایا تھا وہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ مسلمانوں کا سیدھے رستے پر ڈالنا ایسا ہی مشکل تھا جیسا دریا کا بہاؤ کی سمت سے دوسری طرف رخ پھیر دینا۔ اور انگریزوں کو اس بے اعتباری اور بدگمانی کے بعد جس کا غدر کے واقعات نے اُن کے دل میں نقش بٹھا دیا تھا مسلمانوں کی طرف سے صاف کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ ایک طرف سے سرسید کو یہ آواز آتی تھی کہ جبل گردد جبلی نہ گردد اور دوسری طرف سے ان کو یہ جواب ملتا تھا کہ آزمودہ را آزمودن جہل است۔ مگر اس کو وقار

مسلمانوں سے لی تھی اور اُن ہی کو وہ اپنا حریف اور سلطنت کا دعویدار سمجھتے تھے اور بقول سرسید کے اُن کے اس خیال کی تائید کے لئے "بھس بھری ہوئی مردہ کھال دلّی کے قلعہ میں موجود تھی" مسلمانوں کے مذہبی تعصبات کی دھوم تھی اور اُن میں سے بعض جاہل اور ناعاقبت اندیش لوگ اپنی وحشیانہ حرکتوں سے ان تعصبات کا کافی ثبوت دے چکے تھے اور چند مچھلیاں سارے تالاب کو گندہ کر چکی تھیں۔ ان باتوں کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ تمام مسلمان من حیث القوم انگریزوں کی غلط فہمی کا شکار ہو جائیں۔

پس کیا انگریز کیا ہندو اور کیا مسلمان کسی سے اس نازک وقت میں یہ امید نہ تھی کہ اس پانچ کروڑ مخلوق کے بیڑے کو اس طوفان عظیم کے صدمہ سے بچائے۔ مگر خدا مسلمانوں کے ساتھ تھا۔ اُس نے جہاں کوئی بیماری پیدا کی ہے وہیں اُس کی دوا بھی پیدا کی ہے۔ وہی مغضوب و معتوب شہر جہاں کے مسلمان سب سے زیادہ موردِ آفات تھے اور جس پر اگر خدا کا رحم لارڈ لارنس مرحوم کے قالب میں ظہور نہ کرتا تو اُس کا نام و نشان صفحہ ہستی سے مٹ جاتا، اسی شہر کے مسلمانوں میں سے ایک شخص اٹھا جس نے نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ ہندوستان کی تمام رعایا کو عام بغاوت اور عام سازش اور گورنمنٹ کی عام مخالفت کے الزام سے بری کیا۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے مدبرانِ سلطنت نے تسلیم کر لیا کہ ۱۸۵۷ء کا غدر کسی ملکی سازش یا عام بغاوت پر مبنی نہ تھا بلکہ صرف سپاہ کی جہالت اور مذہبی توہمات کا نتیجہ تھا جس کی نسبت لارڈ لارنس مرحوم نے آخر کار فیصلہ کر دیا کہ محض کارتوس کی بدولت ایک سپاہیوں کا ہنگامہ تھا اور سر ولیم کے انڈر سکرٹری وزیر ہند کے نہایت انصاف سے (جیسا کہ سرسید بیان کرتے تھے) اُس کو سپائی وار سے تعبیر کرتے تھے نہ ملکی بغاوت سے۔ مگر باوجود اس کے بھی مسلمانوں کی طرف سے انگریزوں کے دل صاف نہ ہوئے اور وہ اُن کو بدستور انگلش گورنمنٹ کا بدخواہ اور انتظام کا دشمن خیال کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۸۷۲ء میں یعنی غدر کے زمانے سے پندرہ برس بعد ڈاکٹر ہنٹر

بھگتنی پڑتی ہیں۔ مگر مسلمانوں کو سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ جہاں تک نگاہ اٹھاکر دیکھتے تھے اُن کو مایوسی ہی مایوسی نظر آتی تھی۔ وہ اپنی موجودہ حالت سے زمانۂ مستقبل کو زیادہ خوفناک پاتے تھے۔ اُن کو ہندوستان میں رہنا ایسا ہی مشکل ہوگیا تھا جیسے دریا میں رہنا اور مگرمچھ سے بیر۔ مسلمان عموماً بہ حیثیتِ قومی و مذہبی انگلش گورنمنٹ کے مخالف سمجھ لئے گئے تھے، حکام کی نظر میں ان کا اعتبار ہی نہیں جاتا رہا تھا بلکہ وہ سلطنت کے حق میں اور ملک کے امن اور انتظام کے حق میں ایک خطرناک فرقہ سمجھا جاتا تھا۔ مسلمانوں کی بدبختی ہندوستان کی اور قوموں کے لئے پناہ بن گئی تھی اور بقول سرسید کے وہ ہر ایک جرم اور ہر ایک الزام کا بوجھ اس بدنام قوم کے سر پر دھرا جاتا تھا۔ غرضیکہ حکام کی بدظنی اور نفرت کی کوئی حد باقی نہ رہی تھی۔ کسی شخص کا صرف مسلمان ہونا ہی اُس کو بدتر سے بدتر جرم کا مرتکب ٹھہرانے کے لئے کافی سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ نفرت اور بدظنی تمام انگلش نیشن میں سرایت کر گئی تھی تمام اینگلو انڈین اخبار اور ولایت کے اخبار مسلمانوں کے برخلاف اشتعال پیدا کرنے والے آرٹکل لکھتے تھے اور انگریزوں کے دل میں عموماً عداوت اور نفرت کا بیج بوتے تھے، گویا مسلمانوں کو نہ ان انگریزوں سے جو ہندوستان میں حکمران تھے اور نہ اُن سے جو ہر سال ولایت سے مختلف خدمات پر مامور ہوکر آتے تھے کوئی امید باقی نہ رہی تھی اور اُن کے حال پر یہ شعر صادق آتا تھا۔ شعر

اکنوں اگر فرشتہ نکوگویدت چہ سود — درشہر صد حکایتِ بدنامیٔ تو رفت

اگرچہ انگریزوں کی یہ نفرت اور بدگمانی جیسا کہ سرسید مرحوم نے رسالۂ اسبابِ بغاوت اور ڈاکٹر ہنٹر کے جواب میں ثابت کیا ہے اور جس کو بڑے بڑے مدبرانِ سلطنت نے آخر کار تسلیم کر لیا ہے محض غلط فہمیوں کا نتیجہ تھا۔ مگر بدقسمتی سے ایسے اسباب جمع ہوگئے تھے کہ ان غلط فہمیوں کا ہونا نہایت قرینِ قیاس تھا۔ انگریز ہندوستانیوں کی عادت، طبیعت، اُن کی حالت اور اُن کے طرزِ خیالات سے ناواقف تھے۔ ملک کی حکومت اُنھوں نے

افسوس ہے کہ وقت میں اتنی گنجائش نہیں پاتا کہ سرسید کی زندگی کے واقعات مختصر طور پر بھی اس جلسہ میں بیان کرسکوں - اور چونکہ اُن کی لائف عنقریب پبلک میں شائع ہونے والی ہے اس لئے بس اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں سمجھتا۔

لیکن اے صاحبو! اگر آپ مجھکو اجازت دیں تو میں اس موقع پر چند نتائج اُن کی ملکی اور قومی خدمات کے بیان کروں جس سے کسی قدر اس بات کا اندازہ ہوسکے کہ اس مرحوم کی کوششوں سے ہم نے کیا کیا فائدے اٹھائے ہیں اور کہاں تک اُس کی شکرگذاری ہمارے ذمہ واجب ہے۔

صاحبو! اگرچہ ہماری قوم کا میلان ایک عرصہ دراز سے روز بروز پستی کی طرف ہوتا جاتا تھا۔ اُن کی تمام خوبیاں آہستہ آہستہ مٹتی جاتی تھیں، علم میں، دولت میں، اخلاق میں، درجہ میں وہ اپنی ہموطن قوموں سے گرتے جاتے تھے مگر پستی اور تنزل بہ ظاہر چنداں محسوس نہ ہوتا تھا۔ دفعتًا ۱۸۵۷ء غدر کی آندھی اُٹھی جس نے اُس ٹمٹماتے چراغ کو بالکل بجھا دیا۔ یکایک مسلمانوں کی حالت دگرگوں ہوگئی۔ چند گھرانے جو کسی قدر نام و نمود رکھتے تھے ہمیشہ کے لئے معدوم ہوگئے۔ اور ہزاروں معرکہ بغاوت میں مارے گئے، اور ہزاروں جانیں دوسروں کے لئے عبرت کا سبق دینے میں کام آئیں۔ ہزاروں اپنا وطن اور شہر و دیار چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں روپوش ہوگئے اور جو باقی رہے اُن کا یہ حال تھا کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں اور کپڑا ہے تو روٹی نہیں۔ ہزاروں عورتیں بیوہ ہوگئیں، ہزاروں بچے یتیم ہوگئے، گھر چھن گئے جائدادیں ضبط ہوگئیں، بڑے بڑے عالی خاندان فقیر ہوکر تکیوں میں جا بیٹھے۔ بہت سے بھیک مانگتے پھرتے تھے، باورچی گری اور خدمت گاری کرتے تھے مشکیں اٹھاتے تھے، گاڑیاں ہانکتے تھے۔

خیر یہ مصیبتیں تو ہمیشہ تھیں، کہ ہمیشہ لڑائی کے ہنگاموں کے بعد اہل ملک کو

اے زندہ دلانِ پنجاب! آپ بڑے خوش قسمت ہیں کہ آپ نے آنکھ کھول کر روشنی ہی روشنی دیکھی ہے۔ اور اس لئے تعصبات کی وہ گھنگھور گھٹا جو دلی سے لکھنؤ تک تمام مسلمانوں پر چھائی ہوئی تھی اور بہت کچھ اب تک چھائی ہوئی ہے اُس کا شاید پورا پورا اندازہ آپ نہیں کر سکتے۔ ہم نے وہ تعصبات اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں اور اب تک دیکھتے ہیں اور خود ہم نے انھیں تعصبات کے بھونرے میں نشوونما پائی ہے جو بلا مبالغہ اس آیت کے مضمون کا مصداق تھا اوکظلمٰتٍ فی بحرٍ لجی یغشاہ موج من فوقہ موج من فوقہ سحاب ظلمات بعضہا فوق بعض۔ مگر کسی بزرگ کا قول ہے کم نکبۃٍ للہ فیہا رحمۃ۔ (یعنی اکثر بدبختیوں میں خدا کی رحمت چھپی ہوئی ہوتی ہے) وہی تاریکی جو ہم پر چھائی ہوئی تھی ہمارے لئے روشنی کا فرشتہ بن گئی۔ وہی دارالخلافہ جو مسلمانوں کے ادبار اور تنزل کا مرکز اور مذہبی تعصبات کا سرچشمہ تھا، اُس کی خاک سے ایک شخص اٹھا جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا۔ اور آخر وہ فتح نمایاں حاصل کی جس کا ظہور ہم اس وقت اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں کہ جس تعلیم کے نام سے ہم سو سو کوس بھاگتے تھے آج اُسی تعلیم کے لئے یونیورسٹی قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور جس شخص کو کافر و ملحد کہتے تھے اُس کی شکرگذاری میں یادگار قائم کرنا چاہتے ہیں۔

صاحبو! یہ انقلاب عظیم جو ہمارے خیالات میں پیدا ہوا ہے اور ہماری تمام آئندہ ترقیات کی جڑ ہے، اس کو سرسری نظر سے نہ دیکھنا چاہئے۔ ایک لڑکا جو راہ سے بے راہ ہو جاتا ہے، اُس کے خیالات کی اصلاح میں والدین کی تمام عمر گذر جاتی ہے اور وہ ہرگز راہ پر نہیں آتا۔ پھر جس شخص نے بیس پچیس برس کے عرصہ میں لاکھوں کے خیالات بدل دئے اور کروڑوں کو چوکنا کر دیا، اُس کو دیکھنا چاہئے کہ اس منزل میں کیا کیا دشواریاں پیش آئی ہوں گی اور کیسے کیسے سخت مرحلے طے کرنے پڑے ہوں گے۔ وہ کس دل و دماغ کا انسان ہوگا اور اس کی ہمت اور اُس کا استقلال کس درجہ کا ہوگا۔

آپ کی خدمت میں لکھا کہ اب جبکہ آپ کی بذات خود شمولیت کی کوئی امید نہیں رہی تو اپنی تقریر ہی لکھ کر یا لکھوا کر بھیجدیں۔ جس سے آپ کے قیمتی خیالات اس مسئلہ کے متعلق حاضرین معلوم کرلیں چنانچہ یہ وہی تقریر ہے جو مولانا نے لکھ کر نواب محسن الملک کو بھیجی تھی اور محسن الملک نے اُس کو ٣١ر دسمبر ١٨٩٩ء کے اجلاس میں پڑھ کر سنایا تھا۔

صاحبو! یہ ریزولیوشن جس کی تحریک کرنے کی مجھے عزت دی گئی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ ضروری کوئی ریزولیوشن آج تک کانفرنس کے کسی اجلاس میں پیش نہیں ہوا۔ غالباً آپ صاحبوں کو معلوم ہوگا کہ سرسید مرحوم نے جب ولایت سے واپس آکر مسلمانوں کی تعلیم کی بنیاد ڈالنی چاہی تھی، اُس وقت اُن کا ارادہ بجائے محمڈن کالج کے جو اُنھوں نے قائم کیا درحقیقت ایک محمڈن یونیورسٹی قائم کرنے کا تھا۔ چنانچہ جو اسکیم آنریبل سید محمود نے ١٠ر فروری ١٨٧٣ء کو کالج فنڈ کمیٹی میں پیش کی تھی، اُس میں انھوں نے صاف اس بات کی تصریح کی تھی کہ غرض صرف ایک مدرسہ یا کالج ہی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ ایک یونیورسٹی قائم کرنی ہے۔ اور اس اسکیم کی جو کاپی گورنمنٹ میں بھیجی گئی تھی اُس میں بھی یونیورسٹی کا لفظ لکھا گیا تھا۔ مگر گورنمنٹ شمال مغرب نے اس لحاظ سے کہ اس وقت کمیٹی کی ابتدائی حالت تھی اور اُس کی آئندہ کارروائیوں پر کسی طرح اطمینان نہیں ہوسکتا تھا کمیٹی کو یہ جواب دیا تھا کہ اگر وہ محمڈن یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے تو گورنمنٹ اُس میں گرانٹ ان ایڈ نہیں دے گی۔ باوجود اس کے بھی سرسید کا ارادہ مدت تک یہی رہا کہ محمڈن یونیورسٹی قائم کیجائے اور گورنمنٹ کی امداد سے بالکل قطع نظر کیجاوے۔ مگر چونکہ بغیر گورنمنٹ کی منظوری کے یونیورسٹی قائم کرنے میں بے شمار مشکلات کا سامنا تھا اس لئے اُنھوں نے آخر کار محمڈن کالج قائم کرنے پر قناعت کی۔ مگر ٢٦ برس کے عرصہ میں محمڈن کالج نے توقع سے زیادہ ترقی کی ہے اور گورنمنٹ کی نظر میں بہت

۷۔ تقریر متعلق مجوزہ مسلم یونیورسٹی

(منقول از رپورٹ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس متعلق اجلاس دوازدہم ۱۸۹۹ء صفحہ ۱۴۸ تا ۱۷۰)

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا بارھواں اجلاس جو لاہور میں دسمبر ۱۸۹۹ء میں منعقد ہوا تھا ہمیشہ اس بات کے لئے مشہور رہے گا کہ موجودہ "مسلم یونیورسٹی علیگڈھ" قائم کرنے کی سب سے پہلی تجویز کانفرنس کے اس اجلاس میں پیش کی گئی۔ یہ اجلاس کانفرنس کا نہایت اہم اجلاس تھا۔ اور بڑے بڑے لوگوں نے یونیورسٹی کے قیام اور اجرا کے متعلق اس میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور جو لوگ کسی وجہ سے شامل اجلاس نہیں ہوسکے انھوں نے خطوط کے ذریعہ اپنی رائیں اس مسئلہ کے متعلق سکرٹری کانفرنس کو لکھ کر بھیجیں۔ اس اجلاس میں سب سے پہلے مسٹر ماریسن پرنسپل علیگڈھ کالج نے اس مضمون کا ریزولیوشن پیش کیا تھا کہ " اس کانفرنس کی رائے میں مسلمانوں کی ایک علٰحدہ یونیورسٹی کا قائم ہونا مستحسن ہے" اس ریزولیوشن کی تائید میں جس قدر تقریریں ہوئیں اور جس قدر تحریرات اور خطوط وغیرہ اس کے متعلق دفتر کانفرنس میں آئے۔ کانفرنس نے وہ سب اسی زمانہ میں چھاپ کر شائع کردئے تھے۔

نواب محسن الملک نے مولانا حالی کو بھی اس اجلاس میں شرکت کی دعوت دی تھی اور نہایت آرزو ظاہر کی تھی کہ تشریف لاکر اس مسئلہ کے متعلق اپنی زبان سے اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔ مولانا کا بھی مصمم ارادہ تھا کہ خود لاہور جائیں مگر بیمار ہوجانے کے سبب اُن کا یہ ارادہ پورا نہ ہوسکا۔ جب مولانا کے شریک اجلاس ہونے کی کوئی توقع نہ رہی تو ناچار محسن الملک نے نہایت اصرار سے

ڈپٹی کمشنر اسی غرض کے لئے ہمارے قصبہ میں تشریف لائے ہیں۔ مگر میں نہایت افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس قسم کی تحریکیں پہلے بھی ہو چکی ہیں مگر اُن سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا نہیں ہوا۔ اور اگر میری رائے غلط نہ ہو تو ہرگز امید نہیں کہ اس تحریک سے بھی بغیر سرکاری دباؤ کے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہوگا۔

روز بروز ابتر ہوتی جاتی ہے۔ افلاس بڑھتا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساری خوبیاں گھٹتی جاتی ہیں۔ ہم میں بہت سے ایسے ہیں جو ان سب باتوں کو سمجھتے ہیں اور ان تمام رسموں کو لغو اور اپنی تباہی و بربادی کا ایک بہت بڑا ذریعہ جانتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح یہ رسمیں موقوف ہو جائیں، مگر وہ خود ایک رسم بھی موقوف نہیں کر سکتے۔ ان کو شریعت کی باندھی ہوئی حدیں توڑنی آسان ہیں مگر رسم و رواج کی کوئی قید ان سے نہیں ٹوٹ سکتی۔

بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ لوگ جن رسموں کو اپنے حق میں مضر جانتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ کسی طرح موقوف ہو جائیں اُن کو خود موقوف نہیں کر سکتے۔ مگر درحقیقت یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ برٹش گورنمنٹ کی حکومت سے پہلے ہندوستان میں ہزاروں برس سے ڈسپاٹک گورنمنٹ یعنی شخصی حکومت چلی آتی تھی جس میں رعیت کی بھلائی اور بہبودی کا ہر ایک کام بادشاہ کے اختیار میں ہوتا تھا۔ رعیت جس طرح ملکی معاملات میں کچھ دخل نہ رکھتی تھی اسی طرح قومی رفاہ اور فلاح کے کاموں سے اس کو کچھ سروکار نہ ہوتا تھا۔ نہ صرف ہندوستان کی بلکہ تمام ایشیا کی تاریخ میں ایک نظیر بھی ایسی نہیں دیکھی گئی کہ کسی قوم نے بغیر مداخلت سلطنت کے صرف اتفاق باہمی سے کوئی مدرسہ قائم کیا ہو یا کوئی شفاخانہ جاری کیا ہو یا کوئی سوشل رفارم یعنی طریقِ معاشرت کی اصلاح کی ہو یا کوئی اور کام تمام قوم کی بھلائی کا کیا ہو۔ البتہ خاص خاص اشخاص بڑے بڑے مفید کام کرتے تھے کسی وزیر نے تمام قوم کی تعلیم کے لئے مدرسہ قائم کر دیا کسی امیر نے کوئی شفاخانہ جاری کر دیا۔ کسی سردار نے پل بندھوا دیا، کنواں کھدوا دیا، سرائے بنوا دی، اور اسی طرح کے اور مفید کام خاص خاص شخص کرتے رہتے تھے لیکن تمام قوم نے متفق ہو کر کبھی کوئی رفاہ عام کا کام نہیں کیا۔ قوموں کی ہر قسم کی بھلائی یا برائی ہمیشہ سلطنت کے قبضہ میں رہی۔ اور وہ ہمیشہ اپنے تئیں سلطنت کے ہاتھ میں ایسا سمجھتے رہے جیسا مردہ غسّال کے

کرتے، دُکانداری اور صنعت و حرفت کو عیب سمجھتے ہیں، نوکری کرنے کی لیاقت پیدا
نہیں کرتے۔ صرف زمین کی آمدنی پر ہم لوگوں کا گذارہ ہے اور اسی پر ہماری عزت و آبرو
کا انحصار ہے۔ ایسی عزیز چیز کو ذرا ذرا سی فضول اور بیہودہ تقریبوں میں بیع یا رہن کر کے
اپنی اور اپنی اولاد کی زندگی ہمیشہ کے لئے تلخ کر دیتے ہیں۔ وہی لوگ جن کو مدرسہ کی فیس
دینی سخت دشوار ہے اور اس لئے اپنی اولاد کو تعلیم نہیں دلواتے وہی شادی اور غمی
کی بیہودہ رسموں میں گھر بار بیچ کر پانسو ہزار ہزار روپیہ خرچ کر دیتے ہیں۔ اولاد
کی تعلیم جس سے زیادہ کوئی ضروری کام نہیں ہو سکتا اس کو تو اس بہانے سے ٹال
دیتے ہیں کہ تعلیم کا خرچ ہم سے نہیں اُٹھ سکتا اور اُن بیہودہ رسموں میں جن کو نہ عقل جائز
رکھتی ہے اور نہ شرع، اپنی روزی کا آسرا فروخت یا رہن کر کے ہاتھ سے کھو بیٹھتے ہیں
رسموں کی پابندی نے یہاں تک مجبور کر رکھا ہے کہ صرف شادیوں ہی
میں یہ فضولیاں نہیں ہوتیں بلکہ میت میں بھی اسی طرح آنکھیں بند کر کے خرچ کیا جاتا ہے۔
باپ مر گیا ہے، بیوی اور چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ گیا ہے، اُس کی جائداد اور آمدنی
بجائے اس کے کہ اُن صغیر سن بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں خرچ ہو یا اُس
کے کنبے کے رزق کا سہارا ہو برس روز تک برابر برادری کی مہمانداری میں صرف ہوتی
ہے۔ سوئم اور دسویں، بیسویں، چالیسویں، چھ ماہی اور برسی میں سیکڑوں روپیہ
خرچ ہو جاتا ہے۔ بہت سے بھائی عدالت کے جھگڑوں میں اپنا بنا بنایا گھر بگاڑ دیتے
ہیں۔ دس دس بیس بیس روپیہ کی حقیت کے واسطے سینکڑوں ہزاروں روپیہ برباد
کر دیتے ہیں۔ برادری کی پنچایت کے فیصلوں سے جن میں ایک کوڑی خرچ نہیں ہوتی
اور دونوں فریقوں کو کچھ نہ کچھ ملجاتا ہے کبھی راضی نہیں ہوتے۔ اور عدالت میں سیکڑوں
ہزاروں خرچ کر کے ہار اور جیت دونوں صورتوں میں تباہ ہو جاتے ہیں۔
یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے اسباب ہیں جن سے ہماری حالت

۶۔ تقریر متعلق اصلاح و ترقی مسلمانانِ پانی پت

(قلمی مسودہ سے نقل کی گئی)

یہ تقریر مولانا نے باشندگانِ قصبہ پانی پت کے ایک جلسہ میں اپنے اہلِ وطن کی معاشرتی اصلاح اور انسدادِ رسومِ قبیحہ کے متعلق فرمائی تھی۔

جنابِ چیرمین اور تمام حاضرینِ جلسہ!

پہلے اس سے کہ اصل مطلب کے متعلق کچھ بیان کیا جائے اوّل حضور ملکۂ معظمہ قیصرِ ہند کی مادرانہ شفقت اور مہربانی کا جنھوں نے ہندوستان کی بہبودی کے لئے منصف اور خداترس حاکم مقرر کئے ہیں اور پھر اپنے صوبہ کے لفٹنٹ گورنر سر ڈینس فٹز پیٹرک کی عنایت کا جو ہماری بہبودی کا خیال ہم سے بہت زیادہ رکھتے ہیں اور خاص کر اپنے ضلع کے نیک دل اور ہردلعزیز ڈپٹی کمشنر مسٹر آگنیو کا جو صرف ہمارے فائدے کے لئے کرنال سے یہاں تشریف لائے ہیں، شکریہ ادا کرنا ضرور ہے۔

جس کام کے لئے ہم سب لوگ آج اس مقام پر جمع ہوئے ہیں وہ ایسا ضروری کام ہے کہ ہم کو بغیر اس کے کہ اپنے حاکموں کو اس کے لئے تکلیف دیتے خود اس کے سرانجام کرنے کی فکر کرنی چاہئے تھی۔ اگرچہ جس قدر قومیں اس قصبہ میں آباد ہیں ہم کو اُن سب کے ساتھ ہمدردی ہے اور ہماری آرزو ہے کہ سب مل جل کر اپنی حالت درست کریں۔ مگر میں اس موقع پر خاص کر چاروں طرفوں کے مسلمان بسوہ داروں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن سے میری مراد انصاری، مخدوم زادے، راجپوت اور پٹھان ہیں اور جن کا حال روز بروز نہایت سقیم ہوتا جاتا ہے۔

چاروں قوموں میں چند مستثنےٰ آدمیوں کے سوا جو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں

اور منصب پاتے رہے اور اس لئے نہ کبھی ان کو وہ تدبیریں اور کوششیں کرنی پڑیں جن کے
بغیر کسی فارن گورنمنٹ میں رسائی ہونی ناممکن ہے اور نہ اپنے تئیں وہ لیاقتیں پیدا کرنے
کی ضرورت ہوئی جو ایک فارن گورنمنٹ میں رسوخ اور تقرب حاصل کرنے کے لئے ضروری
ہیں۔ پس جو مشکلات کہ مسلمان نوجوانوں کو تجارت و زراعت اختیار کرنے میں نظر آتی ہیں
وہی مشکلات حالتِ موجودہ میں نوکری پر عائد ہوتی ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ایسے پیشے جو خود
ہمارے اختیار میں ہیں ان کو چھوڑ کر ایسا کام اختیار کیا جائے جو ہمارے اختیار میں نہیں بلکہ
گورنمنٹ کے اختیار میں ہے اور جس کا استحقاق پیدا کرنا اور اس کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا
خاص کر اس زمانہ میں سخت دشوار ہے۔

شاید میرا کہنا کہ مسلمانوں میں فارن گورنمنٹ کی نوکری کرنے کی لیاقت عام طور پر
ایسی جیسی کہ ہندوستان کی دیگر اقوام میں ہے نہیں پائی جاتی، آپ کو ناگوار گذرا ہو گا
فی الحقیقت یہ کوئی بُرا ماننے کی بات نہیں ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کوئی مسلمان اس قاعدہ
کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ زیادہ تر مسلمانوں کا ایسا ہی حال ہے جیسا
کہ میں نے بیان کیا۔ اور انصاف یہ ہے کہ اُن کا ایسا ہی حال ہونا چاہئے تھا مسلمانوں
کے سوا ہندوستان کی تمام قومیں ہزار برس سے غیر قوم کی محکوم چلی آتی تھیں، اس لئے صبر و تحمل
فرمانبرداری، زمانہ سازی، فروتنی، رفق و مدارات اور دیگر صفات جن پر ایک محکوم قوم کی
کامیابی بلکہ سلامتی اور زندگی منحصر ہے۔ طول عہد کے سبب ان کی قومی خصلتیں بن گئی تھیں اور جو
لیاقتیں ایک فارن گورنمنٹ میں رسوخ و تقرب حاصل کرنے کے لئے درکار ہیں اُن کی جبلت میں
داخل ہو گئی تھیں۔ یہی سبب تھا کہ جو قومیں ان میں روزگار پیشہ تھیں وہ جس طرح فارسی زبان آسانی
سے سیکھ لیتی تھیں اسی طرح انگریزی سیکھنے میں کوئی مشکل معلوم نہیں ہوئی اور جس طرح وہ مسلمانوں
کے عہد میں تمام دفتروں پر حاوی تھے اسی طرح انگریزوں کے عہد میں تمام دفتر اور آفس
ان سے معمور ہو گئے۔

اور اُن کے بعد ہندوستان کے پچیس کروڑ باشندے ہیں۔ اب کسی طرح ممکن نہیں کہ چھ کروڑ مسلمان جو ہندوستان میں آباد ہیں، وہ اب بھی اپنے آباؤ اجداد کی طرح معاش کو نوکری ہی میں منحصر سمجھیں۔ اور نوکری کے سوا معاش کے اور ذریعوں سے اسی طرح الگ تھلگ رہیں جس طرح اُن کے آباؤ اجداد رہتے تھے۔ گورنمنٹ میں نہ یہ طاقت ہے کہ وہ ہندوستان کی تمام رعایا پر ترجیح دے کر کل خدمات و مناصب انھیں کے حوالے کر دے۔ پھر کیونکر ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے کل مسلمان یا کم سے کم تعلیم یافتہ مسلمان جن کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے تمام پیشوں سے قطع نظر کرکے صرف سرکاری نوکری پر قناعت کر بیٹھیں۔

شاید کسی کے دل میں یہ خیال گذرے کہ جس قوم میں پشتہا پشت سے برابر نوکری پیشہ ہوتے چلے آئے ہیں اور جن کے بڑوں نے کبھی تجارت یا زراعت یا صنعت و دستکاری کے ذریعہ سے معاش پیدا نہیں کی وہ نوکری کے سوا کسی اور ذریعہ سے کیونکر معاش پیدا کر سکتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ خیال بالکل صحیح ہے کیونکہ جس قوم یا خاندان کی چند پشتیں کسی خاص پیشہ میں گذر جاتی ہیں اس کی آئندہ نسلوں میں اس خاص پیشہ کے سوا کسی دوسرے پیشہ کی قابلیت باقی نہیں رہتی۔ تجارت پیشہ قوم کی اولاد ماں کے پیٹ سے تاجر پیدا ہوتی ہے اور زراعت پیشہ قوم کی نسل میں فطرۃً زراعت کی قابلیت ہوتی ہے۔ اسی طرح جو خاندان کئی پشت سے نوکری پیشہ چلا آتا ہے اس کی اولاد میں نوکری کے سوا کسی چیز کی قابلیت نہیں ہوتی۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں میں جس طرح تجارت و زراعت وغیرہ کی قابلیت نہیں ہے اسی طرح حالت موجودہ میں وہ نوکری کی قابلیت بھی نہیں رکھتے۔ کیونکہ جس طرح اُن کے بزرگوں نے تجارت و زراعت وغیرہ کے ذریعہ سے کبھی معاش پیدا نہیں کی، اسی طرح کسی فارن گورنمنٹ میں ملازمت کرنے کا بھی ان کو کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ وہ ہمیشہ مسلمانوں کے عہد میں آسانی سے عہدے

پس اگر میرا خیال صحیح ہو اور فی الواقع تعلیم کے خواہاں حالتِ موجودہ میں صرف وہی لوگ ہیں جو معاش کی طرف سے فارغ البال نہیں تو آپ میں سے ہر شخص کو تعلیم ختم کرنے سے پہلے اس بات کا فیصلہ کر لینا ضرور ہو کہ ہم تعلیم ختم کرنے کے بعد فلاں پیشہ اختیار کریں گے یا فلاں ذریعۂ معاش بہم پہنچائیں گے تاکہ ابھی سے آہستہ آہستہ اس پیشہ کے لئے تیار ہونے اور اس کی لیاقت بہم پہنچانے کا موقع ملے اور مدرسہ چھوڑنے کے بعد اندھا دھند دائیں بائیں ہاتھ مارنے کی ضرورت نہ پڑے، بلکہ جو امر پہلے سے ٹھان لیا گیا ہو اس کو مضبوط پکڑ لیا جائے۔

اگرچہ قوم کو تم سے بڑی بڑی امیدیں ہیں اور اگر خدا کو منظور ہے تو وہ زمانہ عنقریب آنے والا ہے کہ تمھیں میں سے بہت سے ایسے روشن ضمیر پیدا ہوں گے جو اپنے علم کے ذریعہ سے ملک اور قوم میں روشنی پھیلائیں گے اور علم کو علم ہی کے واسطے پڑھیں گے، مگر حالت موجودہ میں تم سے یہ امید رکھنی قبل از وقت ہوگی۔ بالفعل تمھاری تعلیم کا اشرف و اعلیٰ مقصد یہ ہونا چاہئے کہ تم تعلیم کے ذریعہ سے معاش پیدا کرو اور جہاں تک ہو جائز وسائل سے روپیہ پیدا کرکے اپنے اپنے خاندان کو تقویت دو۔ اور جس امید پر تمھارے بزرگوں نے تمھاری تعلیم کے اخراجات اپنے حوصلہ اور بساط سے بڑھ کر برداشت کئے ہیں، ان کی اس امید کو پورا کرکے دکھاؤ۔

مگر اے عزیزو! تمھاری راہ میں بہت سی رکاوٹیں ایسی نظر آتی ہیں کہ جب تک وہ دور نہ کی جائیں گی، اُس وقت تک تمھارا منزلِ مقصود تک پہنچنا نہایت دشوار معلوم ہوتا ہے۔ تمھارے آبا و اجداد نے وہ زمانہ دیکھا تھا جب مسلمانوں کی سلطنت قائم تھی اور شاہی ملازمت میں سب سے زیادہ مسلمانوں کا حصہ تھا، تمام فوجی اور ملکی خدمات کا دروازہ ان کے لئے کھلا ہوا تھا۔ پس ان کے لئے وجہ معاش کا کوئی ذریعہ نوکری سے زیادہ آسان اور سہل الوصول نہ تھا۔ مگر تم جانتے ہو کہ اب وہ زمانہ نہیں ہے۔ اب وہ شاہی ملازمت جس میں مسلمانوں کا سب سے زیادہ حصہ تھا اُس کے مستحق اُن انگلستان کے چار کروڑ باشندے

۵۔ علیگڈھ کالج میں ایک تقریر

(قلمی مسودہ سے نقل کی گئی)

یہ تقریر مولانا نے طلبائے مدرسۃ العلوم مسلمانان علیگڈھ کے سامنے اس موضوع پر فرمائی تھی کہ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد طلبہ کو کیا کرنا چاہئے اور اپنی معاش کس طرح حاصل کرنی چاہئے۔

صاحبو! میں نے آپ کو اس ہال میں جمع ہونے کی آج اس لئے تکلیف دی ہے کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد فکر معاش کا دشوار گذار مرحلہ جو آپ کو درپیش ہے اس کے متعلق آپ کو چند مشورے ایسے دوں جن کو میں اپنے نزدیک آپ کے حق میں بہتر سمجھتا ہوں۔

اے میرے عزیزو! اگرچہ اس بات کا انکار نہیں ہوسکتا کہ ہماری قوم میں تعلیم کا خیال روز بروز زیادہ ہوتا جاتا ہے اور مذہبی خیالات جو تعلیم کے مانع سمجھے جاتے تھے ان کی مزاحمت کم ہوتی جاتی ہے مگر میری رائے جس کو شاید تم بھی تسلیم کروگے اب تک اس باب میں یہ ہے کہ مسلمانوں نے ابھی تعلیم کو بطوع و رغبت قبول نہیں کیا۔ بلکہ جس طرح اضطرار کی حالت میں مکروہ اور حرام چیزیں بھی حلال سمجھ لی جاتی ہیں اسی طرح مسلمانوں نے انگریزی تعلیم کو بہ مجبوری گوارا کر لیا ہے۔ کیونکہ رئیس اور دولتمند مسلمان جو فکر معاش سے فارغ البال ہیں جب تک ان کو اپنی اولاد کی تعلیم کا خیال اور شوق پیدا نہ ہو تب تک یہ ہرگز نہیں سمجھا جاسکتا کہ مسلمان بطوع و رغبت تعلیم کی طرف مائل ہوگئے ہیں بلکہ صاف پایا جاتا ہے کہ جن کو معاش کا کچھ سہارا نہیں ہے یا جو اپنے بعد اولاد کے لئے کوئی جائداد یا آمدنی چھوڑنے والے نہیں ہیں، وہ انگریزی تعلیم کو محض ایک ذریعہ معاش یا نوکری کا سمجھ کر اولاد کو بہ کراہت و مجبوری تعلیم دلواتے ہیں۔

ہے اور ہم ضرور اُس کی غلطی اور جھوٹ ثابت کر سکیں گے۔ لیکن اس بات کے دریافت کرنے کے لئے کہ وہ غلط ہے یا صحیح یا اصول اسلام کے خلاف ہے یا نہیں، ضرور ہے کہ اول اُس کا علم حاصل کیا جائے۔ حکمت یونانیہ جو صدہا سال سے ہمارے ہاں درس میں داخل چلی آتی ہے اُس میں بہت سے مسئلے ابتک ایسے موجود ہیں جو عقائد اہلِ اسلام کے خلاف سمجھے جاتے ہیں۔ باوجود اس کے اُس کو درس میں داخل رکھا گیا ہے۔ کیونکہ جب وہ مسائل اور اُن کے جوابات جو ہمارے علمائے متکلمین نے دئے ہیں، ساتھ ساتھ پڑھائے جاتے ہیں تو اُن مسائل کی غلطی طلبہ کے خوب ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ہیئت جدید کو بھی درس میں داخل کرنا چاہئے، تاکہ اگر وہ فی الواقع اصول اسلام کے خلاف ہو تو ہمارے علما، کو اُس کے رد کرنے کا موقع ملے۔

یہ چند باتیں جو اوپر لکھی گئی ہیں ان کے لکھنے سے یہ غرض نہیں کہ خواہ نخواہ ان کے موافق عمل درآمد کیا جائے بلکہ یہ غرض ہے کہ اُن کو غور سے سنا جائے اور اگر کوئی بات تسلیم کرنے کے قابل ہو تو اُس کے موافق یا اُس میں کمی بیشی کرنے کے بعد عمل درآمد کیا جائے۔

تھی اور اس لئے نہایت آسان معلوم ہوتی تھی۔ مگر اب وہ ایسا دقیق فن ہو گیا ہے کہ تاریخ اور فلسفہ دونوں ہم پلہ سمجھے جاتے ہیں۔ خود بعض مسلمان عالموں کی ایسی تاریخی تحقیقاتیں موجود ہیں جو کسی طرح فلسفہ سے کم رتبہ نہیں رکھتیں۔ منطق کے اصول انسان کی معمولی بول چال سے استنباط کئے گئے ہیں، گویا منطق کی ابتدائی حالت انسان کی معمولی بول چال تھی۔ لیکن اب وہ نظر اور فکر کے عمدہ نتائج کا ایک نہایت عمیق اور دقیق فن سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح تاریخ ابتدائی حالت میں کیسی ہی آسان ہو لیکن اب وہ فلسفہ کے ساتھ پہلو بہ پہلو چلتی ہے۔ جغرافیہ کا حال بھی تاریخ ہی کے قریب قریب ہے۔ مسلمانوں نے صرف ملکی جغرافیہ لکھا تھا اور وہ فی الواقع نہایت آسان تھا لیکن اب جغرافیہ میں بعض قسمیں ایسی اضافہ ہوئی ہیں جو فلسفے اور حکمت میں داخل سمجھی جاتی ہیں۔

بہر حال میرے نزدیک کم سے کم ابتدائی جماعتوں کے لئے کسی قدر عربی جغرافیوں کا انتخاب اور کل جماعتوں کے لئے اُن کی استعداد اور لیاقت کے موافق عربی تاریخوں کے انتخابات بھی سلسلۂ درس میں ضرور اضافہ کرنے چاہئیں۔

تیسری بات جو سب سے زیادہ توجہ کے لائق ہے وہ یہ ہو کہ ریاضی کو ہمارے سلسلۂ درس میں بہت ہی کم حصہ دیا گیا ہے۔ جبر و مقابلہ کو مسلمانوں کے ساتھ وہ خصوصیت ہے کہ بعضوں نے اُس کو خاص مسلمانوں ہی کی ایجاد قرار دیا ہے۔ ہندسہ جو آج تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے وہ بالاتفاق تحریر اقلیدس کے اُس ترجمہ کی بدولت پھیلا ہے جو محقق طوسی نے عربی زبان میں کیا تھا۔ اقلیدس کی یونانی تحریر دنیا سے مفقود ہو گئی تھی۔ صرف محقق کا ترجمہ باقی تھا۔ اول اس کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا اور پھر رفتہ رفتہ تمام یورپ کی زبانوں میں لکھا گیا۔ ہیئت میں مسلمانوں کی ترقی کو تمام یورپ نے تسلیم کیا ہے چنانچہ ستاروں کے بے شمار عربی نام آج تک یورپ کی زبانوں میں موجود ہیں۔ علم مناظر اور مرایا میں جو نہایت مہتم بالشان مسئلے مسلمانوں نے حل کئے تھے اُن میں سے ایک وہ تھا جس کی بنیاد پر زمانہ حال میں عکسی

دوسری بات جس سے اسلامی مدرسوں میں ابتک ابتدائی تعلیم کے متعلق غفلت کی گئی یہ ہے کہ فارسی یا اُردو کو سہل یا ذلیل سمجھ کر اُن کی طرف مطلق اعتنا نہیں کیا گیا بعض مدارس میں صرف اس قدر انتظام ہے کہ جو طالب علم عربی پڑھنا نہیں چاہتے اُن کے لئے ایک آدھ مدرس فارسی سکھانے کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے ۔ مگر جو طلبہ عربی زبان میں تحصیل کرتے ہیں اُن کو جہاں تک کہ میں واقف ہوں فارسی اور اُردو سے بالکل علٰحدہ رکھا گیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ بڑی غلطی ہے۔ فارسی زبان کی اگر تکمیل نہ کرائی جائے تو کم سے کم فارسی کی ادنیٰ اور اوسط درجہ کی کتابیں ضرور سلسلۂ درس میں داخل کرنی چاہئیں۔ اور اُردو زبان میں اگر اور کچھ نہیں تو اس کی انشا اور املا کی ضرور مشق کرانی چاہئے۔

فارسی زبان کی تعلیم کو میں صرف اسی لئے ضروری نہیں کہتا کہ اُس سے اُردو زبان کی تکمیل میں مدد ملتی ہے بلکہ اس لئے بھی اس کی ضرورت ہے کہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے بزرگوں کی نشانی ہے اور اس لئے اس کو قائم رکھنا اور اُس سے مناسبت پیدا کرنا ہمارا فرض ہے ۔ اس کے سوا ہماری اکثر مذہبی، تاریخی، اخلاقی اور علمی کتابیں فارسی زبان میں ہیں۔ اس لئے بھی ہمارے فضلا کو مناسب نہیں ہے کہ اُس سے بالکل اجنبی اور ناآشنا رہیں۔

یہ خیال کرنا کہ عربی زبان سیکھنے سے فارسی اور اُردو دونوں پر قدرت حاصل ہو جاتی ہے صحیح نہیں ہے۔ البتہ اگر انشا کرنے کی پوری پوری مشق طلبہ کو کرائی جائے تو ممکن ہے کہ اُن کو اُردو لکھنے میں کسی قدر مدد ملے۔ لیکن اُردو انشا پردازی میں فاضلانہ لیاقت جس کی کہ ضرورت ہے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی۔ رہی فارسی، سو وہ خود ایک علٰحدہ اور مستقل زبان ہے اور ہماری مادری زبان بھی مثل اُردو کے نہیں ہے، وہ عربی سیکھنے سے کیونکر آ سکتی ہے۔ اُردو زبان جس میں ہزاروں لفظ ہندی بھاشا کے ہیں، جب اُن کے جاننے سے ہم کو بھاشا نہیں آتی تو عربی جاننے سے فارسی (صرف اس وجہ سے کہ اُس

تعلیم سے صرف ونحو کے ساتھ پڑھائے جایا کریں۔ اور عربی بولنے اور لکھنے کی مشق طلبہ کو اول ہی سے شروع کرائی جائے تاکہ صرف ونحو کے قواعد بھی اُن کے دلوں پر نقش ہوں اور عربی زبان میں گفتگو کرنے اور عربی عبارت لکھنے کا ملکہ بھی اُن میں پیدا ہو۔ اور جب تک کتبِ درسیہ کا سلسلہ ختم نہ ہو ہر درجے میں اُس درجے کی حیثیت کے موافق ادب کی کتابوں کا برابر درس جاری رہے چونکہ اس قسم کی کتابیں اور رسالے ہمارے معمولی سلسلۂ درس میں بالکل موجود نہیں ہیں اس واسطے ضرور ہے کہ ایسی کتابیں عربِ عربا کے کلام سے انتخاب کرکے چند علماء کے مشورے اور اتفاق سے ہر درجے کے موافق بنوائی جائیں۔

ابتک ہمارے ہاں ادب کی تعلیم کا یہ طریقہ رہا ہے کہ جب طالب علم منتہی ہونے کے قریب پہنچتا ہے اُس وقت بعض اُستاد اس کو دفعۃً ادب کی نہایت مُغلق اور مشکل کتابیں جیسے متنبی، حماسہ، سبعۂ معلقہ، مقاماتِ حریری وغیرہ پڑھانا شروع کر دیتے ہیں مگر لکھنے کی اب بھی مشق نہیں کرائی جاتی۔ چونکہ طالب علم ابتداء سے عربیت سے اجنبی ہوتے ہیں جب دفعۃً ایک غریب وغیر مانوس نظم یا نثر اُن کے سامنے آتی ہے تو بعض اوقات ان کو یہ خیال ہوتا ہے کہ یا تو یہ عربی زبان نہیں اور یا جس زبان میں ہم نے ابتک کتابیں پڑھی ہیں وہ عربی زبان نہ تھی۔ خلاصہ یہ کہ انکو ان عربی کتابوں سے کوئی معتدبہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اگر کسی کو اس فن سے ایسی ہی مناسبت ہوئی تو اس کو صرف اُس وقت فائدہ ہوتا ہے کہ وہ اُن کتابوں کو اُسی طرح جس طرح کہ استاد نے اُس کو پڑھایا ہے اوروں کو پڑھانے کے قابل ہو جاتا ہے مگر انشا کرنے پر اُس کو کچھ قدرت حاصل نہیں ہوتی۔ (الّا ماشاء اللہ)

ادب کی تعلیم کا ایک نہایت جلیل القدر فائدہ یہ ہے کہ جس قدر ادب سے زیادہ مناسبت پیدا ہوگی اُسی قدر قرآن وحدیث کے سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوگی۔ اور نظمِ قرآن کی عظمت اور جلالتِ شان نہ محض حسنِ عقیدت سے بلکہ اذعانِ قلب اور جزم ویقین کے ساتھ دل میں متمکن ہوگی اور قرآن کے وجوہِ اعجاز بیان کرنے پر قدرت حاصل ہوگی۔

کی عادت نہیں ڈالی جاتی اس واسطے وہ جس طرح عربی عبارت کے انشا پر قادر نہیں ہوتے اُسی طرح فارسی ملکہ اُردو لکھنے پر بھی جیسا کہ چاہیئے قدرت نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ جو طلبہ ہر سال اسلامی مدرسوں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں اُن میں کوئی مصنف یا مؤلف یا مترجم پیدا نہیں ہوتا۔ ہماری قوم میں جس قدر لائق مدرّسوں کی ضرورت ہے اُس سے زائد لائق مصنفوں کی ضرورت ہے۔ عربی سے اُردو میں ترجمہ کرنا ایک عربی داں فاضل کا سب سے زیادہ سہل اور آسان کام معلوم ہوتا ہے مگر افسوس ہے کہ ایسا سہل کام بھی اُن سے سرانجام نہیں ہو سکتا۔

قرآن مجید کا کوئی ترجمہ آج ایسا موجود نہیں ہے جس سے اُس کا مطلب صاف صاف ہر شخص کی سمجھ میں آسکے۔ صرف ایک ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جو اُس وقت کیا گیا تھا جبکہ اُردو زبان نہایت ابتدائی حالت میں تھی۔ اُس وقت کے سیکڑوں محاورے اور الفاظ متروک ہو گئے ہیں اور اس لئے اب وہ ترجمہ اکثر مقام سے سمجھ میں نہیں آتا۔ مگر فارغ التحصیل فاضلوں میں کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا جو اس ضروری کام کو سرانجام کرے اور قرآن مجید کا عام فہم اور خاص پسند ترجمہ کر کے مسلمانوں میں شائع کرے۔ یورپ میں کم سے کم بیس ترجمے قرآن مجید کے مختلف زبانوں میں اب تک ہو چکے ہیں اور ہمیشہ پانچ چار برس کے بعد ایک نیا ترجمہ شائع ہوتا ہے۔

عیسائی قومیں تو قرآنِ مجید کی طرف اس قدر متوجہ ہیں اور ہمارا یہ حال ہے کہ ایک ترجمہ جو اب سے سو برس پہلے ہوا تھا وہی آج تک چلا آتا ہے۔ اس کا سبب سوا اس کے اور کچھ نہیں کہ ہمارے اسلامی مدرسوں میں تصنیف اور تالیف اور ترجمہ کرنے کی لیاقت طالب علموں میں نہیں پیدا کیجاتی۔

پس میرے نزدیک ایک یہ ضروری بات ہے کہ چھوٹے چھوٹے رسالے عربی جملوں اور فقروں کے عربِ عربا، کے کلام سے انتخاب کر کے بنائے جائیں جو ابتدائے

اول تو زمانے کے انقلاب سے مسلمانوں کے کتب خانے برباد ہو گئے جو شہر مسلمانوں کے دار العلم تھے اُن میں ایک بھی قدیم کتب خانہ باقی نہیں رہا اور اگر بالفرض وہ سب کتب خانے قائم بھی رہتے یا اب ویسے ہی کتب خانے پھر قائم ہو جائیں تو بھی قدیم مصنفوں کا نام صرف کتب خانوں سے زندہ نہیں ہوتا بلکہ اُن کی تصنیفات کے درس و تدریس اور پڑھنے پڑھانے سے زندہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو علوم و فنون ہمارے سلسلۂ درس میں بالکل داخل نہ تھے اُن کی مستند کتابیں ہندوستان میں بہت کم پہنچیں۔ زیادہ تر وہی کتابیں شائع ہوئیں جو سلسلۂ درس میں شامل ہو گئی ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ہمارے علما جو مدارس اسلامیہ میں درس دیتے ہیں وہ معمولی کتابیں پڑھاتے پڑھاتے اکتا جاتے ہیں اور اُن کو درس و تدریس کے مشغلے میں سلسلۂ درس کے علاوہ اور کتابیں مطالعہ کرنے کا موقع ملنا دشوار ہوتا ہے۔ اس ترمیم اور تبدیلی سے اُن کو ہمیشہ نئی نئی کتابیں دیکھنے کا موقع ملے گا اور اُن کے علم و فضل کو نہایت ترقی ہو گی۔

درسی کتابیں جیسا کہ سب اہل علم جانتے ہیں اس لئے ہرگز نہیں مقرر کیجاتیں کہ وہ تمام علوم و فنون پر حاوی ہوتی ہیں اور اُن کے پڑھنے کے بعد اور کسی کتاب کے مطالعہ کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ اس لئے مقرر کیجاتی ہیں کہ اُن کے پڑھ لینے سے طالب علم کو ہر علم کے ساتھ فی الجملہ مناسبت اور اُس کی طبیعت میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جائے جس کے سبب سے وہ ہر علم کی اعلیٰ سے اعلیٰ کتاب بغیر اُستاد کی اعانت کے سمجھ سکے۔

ہمارے ہاں جتنے طلبہ فارغ التحصیل ہوتے ہیں اگر تحصیل کے بعد اُن پر افکار دنیوی غالب نہ آئے اور اُن کو کتب بینی کا شوق باقی رہا تو اکثر یہی دیکھا جاتا ہے کہ وہ طلبہ کی تعلیم اور تدریس میں مشغول ہو جاتے ہیں اور اسی کو علمی ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اگر ان کو درسی کتابوں کے علاوہ کسی نئی کتاب کے دیکھنے کا شوق بھی ہوتا ہے تو درس و تدریس کے مشاغل میں ان کو اتنی فرصت نہیں ملتی کہ کسی نئی کتاب کا مطالعہ کر سکیں۔ پس سوا اس کے کہ درسی

ہے، اُس پر بناوٹ یا تصنع کا گمان ہرگز نہیں ہو سکتا۔ عرب کے شعرا کو جب دل سے کسی کی سچی اور بے ریا تعریف کرنی ہوتی تھی تو اس کے مرنے کے بعد مرثیہ لکھتے تھے معن بن زائدہ شیبانی جو کہ خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں ایک نہایت فیاض اور شجاع سپہ سالار گذرا ہے، اُس کے بے شمار مرثئے لکھے گئے ہیں۔ ایک شاعر نے اُس کے مرثئے میں لکھ دیا تھا کہ فیاضی اُس کے ساتھ رخصت ہوگئی، اب کس سے فیاضی کی امید رکھیں۔ خلیفہ مہدی نے اس جرم میں اُس کو دربار سے نکلوا دیا اور امرا نے اس کو صلہ دینا موقوف کر دیا۔ مگر اس پر بھی شعرا معن کے مرثیے برابر لکھتے رہے۔ جعفر برمکی کو جب ہارون رشید نے قتل کروایا تو اُس کے مرثئے لکھنے پر بہت سے شاعروں کو موت کی سزا دی گئی، مگر پھر بھی لوگ اُس کے مرثئے لکھنے سے باز نہ آئے۔

فی الواقع کسی شخص کی شکر گذاری اور احسانمندی کے اظہار کا موقع اس سے بہتر نہیں ہو سکتا کہ اُس کے مرنے کے بعد اُس کی وفات پر افسوس کیا جائے اور اُس کا ذکر جمیل ملک میں پھیلایا جائے۔

اسلام میں بلکہ شاید تمام دنیا میں کوئی واقعہ واقعۂ کربلا سے زیادہ عالم آشوب اور دردناک وقوع میں نہیں آیا۔ اور اسی لئے فی زمانا مسلمانوں میں مرثیہ کا اطلاق صرف جناب سید الشہدا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مرثیوں پر ہونے لگا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان مرثیوں کے سننے سے ہر مسلمان کا ایمان تازہ ہوتا ہے اور خاندانِ نبوت کی محبت جو کہ اسلام کی جڑ ہے دلوں میں موجزن ہوتی ہے اور شہدائے کربلا کے صبر و استقلال کی پیروی اور اتباع کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے، اور اسی لئے قوم کے اکثر بزرگواروں نے واقعۂ کربلا کے بیان میں اپنی عمریں تمام کر دی ہیں اور قوم کے رونے اور رُلانے کے لئے اس قدر ذخیرے چھوڑ گئے ہیں کہ اب کسی شخص کو ان مضامین کے دُہرانے کی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن اس زمانہ میں کہ مسلمانوں کی قومی بندش ڈھیلی ہو گئی ہے اور تمام جماعتوں میں

۳۔ تقریر جلسہ تعزیت حکیم محمود خاں

(منقول از رسالہ "مرثیہ حکیم محمود خاں" مطبوعہ ۱۸۹۲ء)

حکیم محمود خاں مرحوم کے نام سے کون واقف نہیں۔ دہلی کے نہایت حاذق طبیب تھے اور سارے ہندوستان میں شہرت رکھتے تھے۔ اُن کے انتقال پر مولانا حالی نے نہایت پُر اثر اور پُر درد مرثیہ لکھا۔ یہ مرثیہ صرف حکیم محمود خاں کا نہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ دہلی اور سلطنت اسلامیہ کا مرثیہ ہے۔ دہلی کے رؤسا اور عمائدین اور حکیم صاحب مرحوم کے عقید تمندوں نے پُر زور تحریک کی کہ ایک جلسۂ عام حکیم صاحب کی تعزیت میں منعقد کیا جائے اور اس میں خود مصنف محترم کی زبان سے یہ مرثیہ سنا جائے۔ لیکن اُسی زمانے میں مولانا بیمار ہو کر تبدیل آب و ہوا کے لئے پہاڑ پر چلے گئے دو تین مہینے کے بعد جب سفر سے واپس آئے تو ۲۰ محرم ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۴ اگست ۱۸۹۲ء بروز یکشنبہ ایک جلسہ مفتی محمد صدر الدین خاں صاحب مرحوم کی کوٹھی پر منعقد کیا گیا اور اس میں مولانا نے یہ مرثیہ پڑھا جس سے اہل جلسہ بے انتہا متاثر ہوئے۔ مندرجہ ذیل تقریر وہ ہے جو مرثیہ پڑھنے سے پہلے "مرثیہ لکھنے کی ضرورت" پر مولانا نے فرمائی تھی:۔

مسلمانوں میں مرثیہ لکھنے کا رواج ابتدائے اسلام سے پایا جاتا ہے اور اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں بھی عزیزوں، دوستوں اور مشہور لوگوں کے مرثئے برابر لکھے جاتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جدِ بزرگوار عبدالمطلب کے بہت سے مرثئے اب تک موجود ہیں۔ سچ یہ ہے کہ کسی شخص کی نیکی، بزرگی اور مقبولیت کا ثبوت جیسا کہ مرثیہ کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے کسی اور ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔ جو تعریف کسی کے مرنے کے بعد کیجاتی

صائب اور آپ کے معزز مشیروں کی   اور آپ کے جلیل القدر سپہ سالاروں کی
سرگرمی اور آپ کی افواج قاہرہ کی بہادری سے وقوع میں آئی اور جس کے نتائج بادشاہ
اور رعیت دونوں کے حق میں بے انتہا برکتوں سے معمور ہیں مبارکباد دیتے ہیں، اور نہایت
خلوص سے اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ گورنمنٹ کے سایۂ عاطفت میں اس شہر کی تجارت
اور صنعت روز بروز ترقی پکڑتی جاتی ہے۔ اور اگرچہ یہاں کی تعلیم کے وسائل کسی قدر کم ہو گئے
ہیں لیکن یہاں کے عام باشندے خود اپنی تعلیم کا بوجھ اٹھانے پر روز بروز آمادہ ہوتے جاتے ہیں
البتہ چند سال سے نامعلوم قدرتی اسباب ایسے پیدا ہوتے ہیں جن کی وجہ سے
ہر سال موسم برسات اور موسم سرما میں یہاں بیماریوں اور اموات کا شمار حد سے زیادہ بڑھ
جاتا ہے۔ لیکن بالفعل میونسپل کمیٹی اس باب میں غور کر رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حفظان صحت
کے کافی وسائل مہیا کئے جائیں۔ امید ہے کہ جو کام میونسپل کمیٹی کی طاقت سے باہر ہو گا وہ
گورنمنٹ کی امداد اور اعانت سے سرانجام ہو جائے گا۔

نہیں ہے کہ فوج سرکاری کو اس مہم کے اختتام تک جس قدر دقتیں اٹھانی پڑی ہیں اور
جلیل القدر افسروں کی بیش قیمت جانیں جو ایک وحشی قوم کی ناعاقبت اندیشی سے تلف
ہوئی ہیں یہ سب کچھ ملک اور رعیت کی حفاظت اور نگہبانی کے لئے تھا۔ پس ہمارا ضروری
اور نہایت ضروری فرض ہے کہ ہم دل سے، زبان سے اور بدن کے رونگٹیں رونگٹیں سے
گورنمنٹ ہند کا شکریہ ادا کریں۔ اور جب اس بات کا خیال کیا جاتا ہے کہ گورنمنٹ ہند کو
اپنی صائب پالیسی کے برقرار رکھنے میں کیسی کیسی سخت مزاحمتوں کا مقابلہ کرنا پڑا ہے تو یہ
شکرگذاری اور احسانمندی دوچند بلکہ چہارچند ہوجاتی ہے۔

ہمکو معتبر وسیلوں سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جس وقت افغانستان سے انگریزی
سفارت کی مزاحمت وقوع میں آئی اُس وقت خاص کابل میں ایسے سامان جمع تھے کہ اگر چند
روز اس مہم میں اور توقف کیا جاتا تو شر و فساد کی بنیاد کسی قدر زیادہ پائدار ہوجاتی اور
افواج قاہرہ کو اُس کے رفع دفع کرنے میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی۔ لیکن گورنمنٹ ہند نے
ایشیا کے اس مشہور قول پر "کار امروز بفردا مگذار" پورا پورا عمل کر کے ملک اور رعیت کو
تاخیر والتوا کے مضر نتائج سے بالکل محفوظ کر دیا۔

افغانستان کی مہم جو کہ حضور کی دلیرانہ تدبیر سے عمل میں آئی ہے جس قدر گورنمنٹ انگلشیہ
کی اولوالعزمی اور سطوت وجلالت پر گواہی دیتے ہیں اُس سے زیادہ اُس کی بُردباری،
تحمل، چشم پوشی اور فراخ حوصلگی پر دلالت کرتی ہے۔ اور یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ انگلستان
کی بہادر قوم نہ صرف اپنی اولوالعزمی اور شجاعت سے بلکہ زیادہ تر اپنے بےنظیر تحمل و
استقلال اور بےمثل عدل وانصاف اور عجیب بُردباری اور حلم سے دنیا کے پانچوں
بّرِاعظموں پر حکمراں ہوئی ہے۔ وہ کسی پر ایک تنکا نہیں اٹھاتی جب تک کوئی اُس پر شہتیر
نہ اٹھائے۔ وہ کسی پر ایک وار نہیں کرتی جب تک اس پر بہت سے وار نہ کئے جائیں۔
ہم وفادار رعایائے حضور قیصر ہند آپ کو اس مبارک فتح کی بابت جو کہ آپ کی رائے

۲- ایڈریس باشندگانِ دہلی بحضور وائسرائے

(قلمی مسودہ سے نقل کیا گیا)

یہ ایڈریس گورنمنٹ انگریزی کے افغانستان کی جنگ میں فتح پانے کے بعد ۱۸۷۹ء
میں باشندگانِ دہلی کی طرف سے ہز ایکسیلنسی رائٹ آنریبل اڈورڈ رابرٹ لٹن
بلور لٹن برن لٹن آف نیب ورتھ جی۔ ایم۔ ایس۔ آئی گورنر جنرل ہند کی خدمت
میں پیش کیا گیا تھا۔ مسودہ مولانا نے بنا کر دیا تھا۔

اس بات کو بہت تھوڑا زمانہ گذرا ہے کہ ہم باشندگانِ دہلی وفادار رعایائے حضور ملکہ معظمہ سلطنتِ برطانیہ عظمٰی قیصر ہند دام اقبالہا آپ کو بحیثیت نائب السلطنت ہونے کے ایک ایسے شان و شوکت اور تزک و احتشام کے ساتھ اورنگ قیصری پر جلوہ افروز دیکھ چکے ہیں جس کی نظیر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام عالم کی تاریخ میں مشکل سے مل سکتی ہے۔ ابھی وہ خوشی اور مسرت اور افتخار جو کہ ہم رعایائے دہلی کو دربارِ قیصری کے منعقد ہونے سے حاصل ہوا تھا ہمارے دل سے فراموش نہ ہونے پایا تھا کہ ہم نے حضور والا کو ایک ایسی فتحِ نمایاں کے بعد جس سے سراسر ہندوستان کی بہبودی حال و مآل متصور ہے دیکھا۔ پس ایسے مبارک موقع پر جو بے انتہا شکر گذاری اور احسانمندی اور خیر خواہی اور خیر اندیشی کا جوش ہمارے دل میں خود بخود پیدا ہوا ہے اُس کا ظاہر کرنا بے محل نہ ہوگا۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ افغانستان کی مہم نہ خزانہ سرکاری کی توفیر اور نہ محاصل ملکی کی افزائش کے واسطے اختیار کی گئی تھی بلکہ صرف اس لئے اختیار کی گئی تھی کہ ہندوستان کے امن و امان میں جو رخنے نظر آتے ہیں وہ مسدود کئے جائیں اور شمالی خدشوں کی روک ٹوک کے لئے ہندوستان کی سرحد کو استحکام دیا جائے۔ ہم کو اس میں کچھ شک اور شبہ

کے لئے کی گئیں اور کیجاتی ہیں اگرچہ اُن کے ضروری ہونے میں کچھ کلام نہیں ہے اور وہ
بیشک اس قابل ہیں کہ جب موقع ملے کوشش کیجائے لیکن انگریزی رائیں غلط نہیں تو اکثر
اُن میں سے ایسی ہیں جو بالفعل عام رایوں اور عام خواہشوں کے برخلاف معلوم ہوتی
ہیں اور اسی سبب سے جن لوگوں کی بہبودی کے لئے وہ کیجاتی ہیں اکثر وہی اُن میں
رخنہ انداز ہوتے اور تقریبًا تمام قوم اُن میں مدد دینے سے انکار کرتی ہے۔ پس میرے نزدیک
جو تدبیریں عام بہبودی کے لئے کیجائیں وہ بالمقدور ضرور ایسی ہونی چاہئیں جن کے نتائج
اور فوائد عام لوگوں کی سمجھ میں بآسانی آجائیں۔ مثلاً بالفعل بہ نسبت اس کے کہ ایک مدرسہ
فزیکل سائنس کی تعلیم کے لئے قائم کیا جائے بہتر ہے کہ ایک تعلیم خانہ صنعت اور
دستکاری کے لئے کھولا جائے۔ کیونکہ پہلی صورت کی نسبت دوسری صورت عام خواہشوں
کی زیادہ پورا کرنے والی ہے۔ یا مثلاً پہلے اس سے کہ بیاہ شادیوں کی فضول خرچیاں بند
کی جائیں بہتر ہے کہ موت اور غمی کے اخراجات موقوف کئے جائیں۔ کیونکہ پچھلی تجویز عام
رایوں کے موافق زیادہ کارگر معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح اور بہت سی مثالیں ایسی ہیں جن
کے ذکر کرنے کا یہ وقت نہیں ہے۔

ہاتھ اٹھانا پڑا۔ اُن سے بھی ہمارا کچھ کام نہیں چل سکتا، کیونکہ وہ خود اپنے کام میں درماندہ ہیں۔ تیسرے وہ جنھوں نے علم کو علم بھی سمجھا اور اپنے قویٰ کو بھی محفوظ رکھا اور مدرسہ چھوڑنے کے بعد بھی کتاب کو ہاتھ سے نہیں ڈالا، یہ لوگ البتہ بہت کچھ کر سکتے ہیں مگر افسوس ہے کہ یہ بھی کچھ نہیں کرتے۔ جن باتوں کی آج ہندوستان میں ضرورت ہے اُن کے سامان انگریزی زبان میں ہماری ضرورت سے بہت زیادہ موجود ہیں۔ اور سردست ہم کو اس بات کی حاجت نہیں معلوم ہوتی کہ ہمارے ملک میں بھی بیکن اور نیوٹن جیسے عالی دماغ پیدا ہوں۔ بلکہ اب صرف ان کی تحقیقات کو اپنی زبان میں لانا ہے، گویا خرمن بالکل تیار ہے اور اس کی تیاری میں جو مشکلیں پیش آنی تھیں وہ آچکیں۔ خرمن کے مالکوں نے اُس کو سب لوگوں پر وقف کر دیا۔ اب جن کے پاس باربرداری کا سامان موجود ہے وہ اس کو بھریں اور قحط زدہ ملک میں پہنچائیں پس اگر ہمارے لائق و فائق ہموطن کچھ بھی توجہ کریں تو اپنے ملک کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

ہندوستانیوں سے عموماً دو قومیں مراد لیجاتی ہیں۔ ایک ہندو دوسرے مسلمان۔ یہ دونوں اپنے اپنے وقت شائستگی کے اعلیٰ درجہ کو پہنچ چکے ہیں۔ ہندوؤں کی شائستگی اُس وقت میں مانی گئی ہے جبکہ تمام دنیا میں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ہومر شاعر نے اس زمانہ کے یونانیوں کا حال مفصل لکھا ہے، جبکہ منو کا مجموعہ تالیف ہوا۔ اُس زمانے میں جو حال ہندوستان اور یونان کا تھا اُس کے مقابلے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندو اگرچہ ہمت اور دلاوری میں یونانیوں کے برابر نہ تھے مگر عام تہذیب اور شائستگی اور قوانین کی عمدگی اور انتظام کی خوش اسلوبی اور علم و ہنر کی ترقی میں یونانیوں سے بہت بڑھ کر تھے۔ مسلمانوں کی ترقی کے زمانہ کو کچھ بہت عرصہ نہیں گذرا۔ یورپ کے اکثر مورخوں نے جو مسلمانوں کی ترقیات کا حال لکھا ہے وہ ہماری موجودہ حالت سے اس قدر زیادہ ہے کہ اس زمانہ میں اس پر مشکل سے یقین آتا ہے اور ہم کو شرم آتی ہے کہ اس پستی اور تنزل کی حالت میں اپنے بڑوں کی ترقیات

کی آج تمام دنیا میں دھوم ہے، اُس کی بنیاد صرف اس طرح پڑی تھی کہ قصبہ کیمبرج میں جو کہ لندن سے
قریب ساٹھ میل کے واقع ہے ایک باہمت پادری نے اپنے ہموطنوں کی تعلیم کے لئے ایک چھوٹا سا
مدرسہ قائم کیا تھا اور کسی قدر اپنی جائداد اُس کے خرچ میں لگا دی تھی۔ رفتہ رفتہ اُس میں
ترقی ہوتی رہی، یہاں تک کہ اُس کی بدولت تمام برطانیہ میں علم کی روشنی پھیل گئی۔ اب وہاں
بہت بڑے بڑے سولہ کالج ہیں جن میں تقریبًا تین ہزار آدمی ہزار ہزار روپیہ ماہوار تک کے
نوکر ہیں۔ اگر وہ جوانمرد پادری جس نے اس بڑے دارالعلم کی بنیاد ڈالی تھی یہ خیال کرتا کہ میری
کوشش سے کیا ہو سکتا ہے تو کیمبرج جو آج تمام دنیا میں مشہور ہے اُس کا کوئی نام بھی نہ جانتا اور
لاکھوں آدمی جو اُس کی بدولت امیر کبیر ہوئے یا حکیم اور فلاسفر کہلائے اُن کا کوئی ذکر بھی نہ کرتا۔
اسی طرح بے شمار مثالیں ایسی پائی جاتی ہیں کہ ایک ایک آدمی کی کوشش سے ملک کے ملک سرسبز
و شاداب ہو گئے ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگ جو درحقیقت قومی ترقی کے ضروری آلات ہیں اور جن کی
توجہ سے ہمارے عقدے بہت آسانی سے حل ہو سکتے ہیں انھوں نے بھی آج تک ملک کو
کچھ ممنونِ احسان نہیں کیا۔ سُستی اور بے پروائی جو اس ملک کا خاصہ ہے، اُن میں بھی ویسی ہی
پائی جاتی ہے جیسے اُن کے عام ہموطنوں میں۔ وہ اپنے نامہذب ہموطنوں میں عیب نکالتے
ہیں مگر اُن کے عیب دور کرنے میں کوشش نہیں کرتے۔ وہ اُن کو ہاف سولائزڈ کہہ کر جتنا
تعجب کرتے ہیں اتنا افسوس نہیں کرتے۔ اس قابلِ ادب جماعت میں بھی کئی قسم کے آدمی ہیں۔
ایک وہ جو تعلیم کو فقط نوکری کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور جب ان کو لیاقت کی سند حاصل ہو جاتی
ہے پھر علم اور کتاب سے کچھ سروکار نہیں رکھتے۔ ان لوگوں سے ہم وہ امید نہیں رکھ سکتے جو کہ
ایک تعلیم یافتہ گروہ سے رکھنی چاہئے، کیوں کہ ان پر تعلیم کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ دوسرے وہ
لوگ جنھوں نے واقعی علم کو علم ہی سمجھ کر سیکھا ہے، مگر وہ اپنے ذوق و شوق میں ایسے غرق
ہوئے کہ انھوں نے صحت اور طاقت کا کچھ لحاظ نہ کیا اور اپنی حد سے بہت آگے بڑھ گئے۔
نتیجہ اُس کا یہ ہوا کہ دل و دماغ نے ان کو جواب دے دیا اور ان کو بہ مجبوری مطالعہ کتاب سے

دونوں گروہوں کو ملک کی ترقی اور بہبودی میں اُسی قدر دخل ہے جیسے گورنمنٹ کو۔ بہت سے فائدے ایسے ہیں جو ملک کو بغیر اُن کی کوشش کے ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔ مگر ہمارے وطن کے یہ دونوں معزز گروہ آج تک ملک کے حقوق سے کچھ بھی سبکدوش نہیں ہوئے۔ دولتمندوں میں اکثر بے پروائی سے اور بعضے اس خیال سے کہ ہماری کوشش سے تمام ملک کی حالت کیونکر بدل سکتی ہے۔ ہموطنوں کی بھلائی کا خیال نہیں کرتے۔ اور جو لوگ بے پروائی سے ادھر متوجہ نہیں ہوتے اُن سے ہم یہ پوچھتے ہیں کہ اگر ان کو اپنے ہموطن بھائیوں کی پروا نہیں ہے تو کیا اس بات کی بھی پروا نہیں ہے کہ اُن کی دولت کی ترقی ہو، اُن کی عزت گورنمنٹ میں زیادہ ہو، اُن کی اولاد علم اور لیاقت حاصل کرے اُن کے خاندان کی عزت و آبرو ہمیشہ بنی رہے۔ اگر اُن کو یہ تمام خواہشیں ہیں تو میں سچ کہتا ہوں کہ بغیر قومی ترقی کے وہ ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جبتک تمام قوم کسی نہ کسی قدر عزت کا استحقاق حاصل نہیں کرتی، اُس قوم کے چند آدمی اصلی عزت کے مستحق نہیں ہو سکتے جب تک تمام قوم میں علم کی روشنی نہیں پھیلتی علم کا سلسلہ کسی خاندان میں قائم نہیں رہ سکتا جبتک تمام قوم کے اخلاق درست نہیں ہوتے کوئی شخص خاندان کے اخلاق کی حفاظت نہیں کر سکتا جب تک تمام قوم مرفہ الحال نہیں ہوتی کوئی شخص دولت وحشمت سے اصلی خوشی حاصل نہیں کر سکتا۔

قوم ایک درخت کی مثال رکھتی ہے جس کی ٹہنیاں اُس کے مختلف خاندان ہیں اور اُس کے پتے ہر ایک خاندان کے مرد و عورت۔ جب تک درخت کی جڑ ہری ہے اُس کی ٹہنیاں اور پتے بھی ہرے ہیں لیکن جب جڑ کو پانی نہ پہنچے گا ٹہنیاں اور پتے سب سوکھ جائیں گے اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری کوشش سے تمام ملک کی حالت کیونکر بدل سکتی ہے، ان کی خدمت میں یہ عرض کیا جاتا ہے کہ صرف دو خیال ہیں جنھوں نے دنیا کے تنزل اور ترقی پر بہت کچھ اثر کیا۔ ایک یہ کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ دوسرے یہ کہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ پہلے خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ نہ ہوا اور دوسرے خیال نے دنیا میں بڑے بڑے عجائبات ظاہر کئے۔ کیمبرج یونیورسٹی جس

میں تمام اراضی برابر حصوں پر تقسیم کر دی تاکہ رعایا میں دولت و افلاس کا فرق باقی نہ رہے اور ایسی صورت ہو جائے کہ جیسے ایک ماں جائے بھائی اپنے مورث کے ترکہ میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ پھر یہ قاعدہ جاری کیا گیا کہ لوگ گھروں میں کھانا چھوڑ دیں بلکہ سب آپس میں مل جل کر کھانا کھایا کریں اور ہر شخص یہ خیال رکھے کہ ساتھیوں میں سے کوئی بھوکا تو نہیں رہا۔

سولن نے اتھنز میں یہ قاعدہ جاری کیا تھا کہ جب کوئی شخص کسی کو تکلیف پہنچائے تو دیکھنے والا مغلوب کی مدد کرے اور غالب کو سزا دلوائے تاکہ لوگوں کو ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہونے کی عادت پڑے اور ساری رعیت ایک خاندان کے آدمی ہو۔ اس کے سوا یہ بھی حکم تھا کہ جو لوگ رفاہِ ملک کے جلسوں میں شریک نہ ہوں اور اس بات کے منتظر رہیں کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے وہ جلاوطن کئے جائیں اور اُن کی جائداد ضبط کی جائے۔ ان تجویزوں سے لوگوں کے دلوں میں ہمدردی کا جوش بہت ہو گیا تھا اور ہر شخص یہ جانتا تھا کہ ہم سب ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہیں۔

ہم کو بھی ہماری گورنمنٹ طرح طرح سے ہمدردی کی تعلیم دے رہی ہے۔ قومی ہمدردی کا بڑا سرچشمہ سررشتہ تعلیم ہے کیونکہ اس کے سبب سے بے شمار لڑکوں کو ایک معقول مدت تک باہم میل جول رکھنا پڑتا ہے اور رفتہ رفتہ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت کا بیج بویا جاتا ہے۔ پس ضرور ہے کہ جب وہ مدرسہ چھوڑ کر ملک میں متفرق ہوں، ان کا تعلق اور رابطہ ہمیشہ برقرار رہے۔ اس کے سوا گورنمنٹ کا یہ اصول کہ جو چندہ علوم یا فنون کی تعلیم کے لئے رعایا کی طرف سے فراہم ہو اُسی کی برابر گورنمنٹ کی جانب سے امداد کی جائے، ہم کو زبردستی اس بات کی طرف کھینچتا ہے کہ تھوڑے بہت ہاتھ پاؤں ہلا کر گرانٹ اِن ایڈ کا استحقاق حاصل کریں اور اپنے ملک میں علم کی روشنی پھیلائیں۔

میونسپل کمیٹیاں جو سرکار نے جابجا شہروں اور قصبوں میں قائم کی ہیں، اگر پورا پورا اپنا فرض ادا کریں اور جس غرض کے لئے مقرر ہوئی ہیں اُسی کو مدنظر رکھیں تو یہ بھی ہمدردی کے اچھے

کارخانہ درہم برہم ہو جائے۔

شاید یہاں یہ شبہ پیدا ہو کہ دنیا میں جو کام اپنی ذاتی اغراض کے لئے کئے جاتے
ہیں وہ ہمدردی میں کیونکر داخل ہو سکتے ہیں۔ مثلاً کسان زمین کے بونے جوتنے میں جو
کوشش کرتا ہے اور بیوپاری جو مال بھر کر سیکڑوں کوس لیجاتا ہے اُس سے اگرچہ اوروں کو
بھی فائدہ پہنچتا ہے مگر اُن کا اصل مقصود اپنا ذاتی فائدہ ہے پس اس کو ہمدردی کیونکر کہہ
سکتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جو خصلتیں انسان کو قدرت نے تعلیم کی ہیں وہ کبھی اُس کے
فائدے سے خالی نہیں ہوتیں۔ پس ہمدردی جو کہ آدمی کی قدرتی خاصیت ہے اُس کے فائدے
سے خالی نہیں ہو سکتی۔ جو شخص کسی اپنے ہمجنس کو نفع پہنچاتا ہے وہ حقیقت میں اپنی آسائش
کے کسی وسیلہ کو تر و تازہ کرتا ہے اور ایک یا چند واسطوں سے اپنی ذات کو فائدہ پہنچاتا
ہے۔ قدیم زمانہ میں تھیاوالے جو کہ دریائے ڈنیوب اور ٹائبر کے درمیان بستے تھے جب
اُن کے بڑے بوڑھے اپنے بال بچوں کو باہم ہنستے بولتے ایک دوسرے کے رنج و راحت
میں شریک پاتے تھے تو یہ کہا کرتے تھے کہ نہایت عمدہ ترکہ جو ہم اپنی اولاد کے لئے چھوڑ جائیں
گے وہ یہی ہمدردی ہے جس کے آثار ہماری اولاد میں پائے جاتے ہیں۔

ہمارے ہموطن بھی ہمدردی کی اصل سے بے خبر نہیں ہیں۔ کوئیں بنوانے، پیاؤ بٹھانی
سبیل لگانی، محتاجوں کی خبر لینی، بیواؤں کی مدد کرنی، بیاہ شادیوں میں شریک ہو کر ایک
دوسرے کا کام بٹوانا، بیمار کی عیادت، میت کی تعزیت اور اسی طرح اور بہت سی باتیں ہمارے
ملک میں بھی پائی جاتی ہیں۔ بعض اوقات یہ قدرتی خصلت جس کا نام ہمدردی ہے مشق اور تعلیم سے
تمام قوم میں پھیل جاتی ہے اور اس کا اثر کسی قدر تیز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ لائی کرگس اور سولن
جو یونان کے دو بڑے مقنن گزرے ہیں، انھوں نے اسپارٹا اور ایتھنز والوں کی ترقی کے
لئے جہاں اور بہت سی تجویزیں کی تھیں، انھیں میں سے ایک تجویز یہ بھی تھی کہ لوگوں کو طرح طرح
سے ہمدردی کی ترغیب دی جائے۔ چنانچہ اسی خیال سے لائی کرگس نے اول اسپارٹا

فہرست کتب انجمن ترقی اُردو

نام کتاب	قیمت
مقالاتِ حالی (حصہ اوّل) (از مولانا حالی مرحوم)	مجلّد چار روپے۔ غیر مجلّد ساڑھے تین روپے۔
اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام (از مولانا عبدالحق)	غیر مجلّد آٹھ آنے۔
مرحوم دہلی کالج (از مولانا عبدالحق)	غیر مجلّد ایک روپیہ آٹھ آنے۔
تذکرۂ ریختہ گویاں (از گردیزی)	مجلّد ایک روپیہ چار آنے غیر مجلّد چودہ آنے۔
مخزنِ شعرا۔ (از قاضی نورالدین فائق)	مجلّد ایک روپیہ چار آنے غیر مجلّد چودہ آنے۔
تذکرہ ہندی (از مصحفی)	مجلّد دو روپے غیر مجلّد ایک روپیہ دس آنے۔
ریاض الفصحا (از مصحفی)	مجلّد دو روپے آٹھ آنے غیر مجلّد دو روپے۔
عقدِ ثریا (از مصحفی)	مجلّد ایک روپیہ دو آنے غیر مجلّد بارہ آنے۔
دریائے لطافت (از سید انشا)	مجلّد تین روپے غیر مجلّد دو روپے آٹھ آنے۔
گلِ عجائب (تذکرہ از تمنا اورنگ آبادی)	مجلّد ایک روپیہ دس آنے غیر مجلّد ایک روپیہ دو آنے۔
خطباتِ گارساں دتاسی	مجلّد پانچ روپے غیر مجلّد چار روپے آٹھ آنے۔
نکات الشعرا (تذکرہ از میر تقی میر)	مجلّد دو روپے چار آنے غیر مجلّد ایک روپیہ
دیوان تاباں (از عبدالحی تاباں)	مجلّد دو روپے چار آنے غیر مجلّد ایک روپیہ بارہ آنے۔

المشتہر

انجمن ترقی اُردو۔ اورنگ آباد۔ دکن